فکری زاویے

ڈاکٹر پریمی رومانی

رچنا پبلی کیشنز پونے (مہاراشٹر)

فکری زاویے

ڈاکٹر پریمی رومانی

انتساب

اُردو زبان کے معروف نقاد، محقق اور دانشور
جناب پروفیسر قمر رئیس (مرحوم)
کے نام
اللہ اُن کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

ڈاکٹر پریمی رومانی

ترتیب

اقبالیات

نثر

تاثرات

اپنی بات

''فکری زاویے'' حاضر خدمت ہے۔
اس کتاب میں مختلف موضوعات پر میرے تحقیقی وتنقیدی مقالات شامل ہیں جن کو میں نے ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے تا کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں فوری تاثر پیدا ہوجائے اوران کی دلچسپی قائم رہے۔ان مقالات میں سے بعض مقالات برصغیر ہندوپاک کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔نہ صرف قارئین کرام نے بلکہ اردوزبان وادب کے مقتدرادیبوں اوردانشوروں نے اپنی غیر معمولی دلچسپی دکھا کران مقالات کو پسند فرمایااور میری حوصلہ افزائی کی۔بعض کرم فرماؤں نے مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں اُن تمام حضرات کادِل کی عمیق گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔
''فکری زاویے'' اپنے موضوعات کی تنوع مندی سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔اس میں آپ کوعصری ادبی رجحانات سے متعلق بعض نئے مباحث ملیں گے۔شاعری،شخصیات، افسانہ نگاری، اقبالیات، یادِرفتگاں اورتاثرات کے حوالے سے میں نے اس کتاب میں ادب کے گوناگوں موضوعات پر بحث کی ہے اورکئی سنجیدہ علمی اور ادبی پہلوؤں کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔کشمیر میرا مادروطن ہے۔اس لئے میری ہرتحریر میں اس کا عکس نظر آئے گا''فکری زاویے'' میں بھی بعض ایسے مباحث ملیں گے جن میں کشمیر کے شعروادب

پر کھل کر بحث کی گئی ہے اور بعض ایسی شخصیات کے گونا گوں علمی وادبی کارناموں کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ جن پر کم لکھا جا چکا ہے۔

بہر حال میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو گیا ہوں ۔ اس کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔

مجھے آپ کی زرین رائے کا انتظار رہے گا۔

۲۵ر فروری ۲۰۱۷ء

پریمی رومانی

1806-D "ASAWARI"
NANDED CITY SINHGED ROAD
PUNE-411041
E-mal- premi_romani@yahoo.co.in

سیمابؔ اکبرآبادی کی شاعری

سیمابؔ اکبرآبادی تاریخ ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔اُنہوں نے نظم ونثر دونوں شعبوں میں کارنامے انجام دیئے لیکن بنیادی طور پر وہ ایک شاعر تھے اور شاعری کی ہر صنف پر قدرت رکھتے تھے۔یہی سبب ہے کہ انہوں نے غزل اور نظم کے علاوہ تمام شعری اصناف میں اپنے جوہر دکھائے لیکن سیمابؔ کی اصل دلچسپی نظم سے تھی جس کو وہ ہمیشہ سب سے بہتر صنفِ کلام کا نام دیتے تھے۔ایک جگہ اپنے خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"نظم،غزل گوئی سے زیادہ ضروری اور بہتر صنف کلام ہے۔"(۱)

سیمابؔ کی شاعری شروع سے ہی ایک نئے انداز سے سامنے آئی۔انہوں نے اپنے جذبے اور احساس کی گہرائیوں کو نئے آہنگ سے پیش کر کے ایک نئے شعری دبستان کا آغاز کیا۔جس کا ثبوت اُن کے کلیم عجم،سدرۃ المنتہیٰ،کارِ امروز،ساز و آہنگ،شعرِ انقلاب،عالم آشوب،نیستان،تفسیر غم،سرودِ غم،لوح محفوظ اور سازِ حجاز وغیرہ جیسے مجموعوں سے ملتا ہے۔

سیمابؔ اکبرآبادی کا نام عاشق حسین تھا۔وہ ۱۸۸۰ء میں اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔اُن کے والد مولانا محمد حسین صدیقی ٹائمس آف انڈیا پریس (اجمیر شریف)

---

(۱) ماہنامہ "شاعر" بمبئی جلد ۴۰ شمارہ اجنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۲

میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وہ بڑے دین دار، پرہیز گار اور شریف النفس بزرگ تھے اور مذہبی کاموں میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے عاشق حسین کو عربی اور فارسی کی تعلیم دلائی۔ بعد میں مقامی انگریزی اسکول میں داخل کرایا جہاں سے اُنھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد سیماب نے اعلیٰ تعلیم کے لئے گورنمنٹ کالج اجمیر میں داخلہ لیا۔ یہاں سے ہی اُن کی شعر گوئی کا آغاز ہوتا ہے۔ سیماب کی طبیعت چونکہ بچپن سے ہی شعر گوئی کی طرف مائل تھی، کالج میں مولوی سید بدرالدین قریشی اکبر آبادی مرحوم، مولوی تحسین علی اجمیری مرحوم اور مولوی عابد جیسے اساتذہ کی صحبت میں رہ کر شعر گوئی کا ذوق پیدا ہو گیا اور نصاب میں جتنے بھی فارسی اشعار تھے اُن کو اُردو میں منتقل کرنے کے بعد اساتذہ کے سامنے پیش کرنا، اُس دور میں سیماب کا معمول بن گیا تھا۔ جس پر اُن کے اساتذہ کافی خوش ہوتے تھے اور انہیں جامیؔ، سعدیؔ، عرفیؔ، قاآنیؔ وغیرہ جیسے اساتذہ فن کا مطالعہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اسی مطالعے سے اُنھوں نے شعر و ادب کے رموز سے آگاہی حاصل کی اور ان کے ذوقِ ادب کی تہذیب ہوئی۔ سیماب ۱۸۹۷ء میں اپنے والد کے سائے سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ اُنہیں تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا اور گھر گرہستی کا سارا بوجھ اُنہی کے کندھوں پر آن پڑ گیا۔ اُن کو ملازمت کے سلسلے میں کانپور، آگرہ، اجمیر شریف وغیرہ کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ کانپور میں حکیم ازلؔ لکھنوی، محبؔ لکھنوی اور دیگر اساتذہ فن کی صحبت میں رہ کر اُن کی شعر گوئی میں نکھار پیدا ہو گیا۔ چونکہ سیماب کی طبیعت ''دبستان دہلی'' کی طرف مائل تھی اس لئے ۱۸۹۸ء میں سخا صاحب کی سفارش پر وہ نواب داغؔ کے تلمذ میں شامل ہو گئے (۱) داغؔ کی شوخیِ فکر اور زبان و بیان کے رکھ رکھاؤ سے وہ کافی متاثر ہوئے، اس لئے سیماب کے یہاں اپنے استاد سے فن کی ایک نئی سمت پا کر خیالات اور طریقۂ اظہار میں مناسبت اور مماثلت کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ سیماب کے پاس جذبہ و احساس کی ندرت تھی جس کو داغ جیسے استاد نے جلا بخشی۔

(۱) سہ ماہی ''اُردو ادب'' علی گڑھ شمارہ ۲، ۱۹۶۷ء، ص ۹-۱۰

سیمابؔ بچپن سے ہی شاعرانہ ذہن لے کے آئے تھے۔اس لئے وہ ملازمت کی ذہنی غلامی برداشت نہ کر سکے۔ کچھ عرصہ ملازمت کر کے انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔۱۹۲۲ء میں انہوں نے ''قصرالادب'' کے نام سے آگرے میں ایک ادارہ قائم کیا۔ جہاں وہ باقاعدگی سے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے رہے۔ سیماب نے کئی رسائل واخبارات بھی اپنی ادارت میں جاری کئے۔جن میں رسالہ ''مرصع'' آگرہ، رسالہ ''پیمانہ''، ہفتہ وار ''تاج'' اور ماہنامہ ''شاعر'' قابل ذکر ہیں۔

سیمابؔ علمی وادبی کاموں میں زندگی بھر مصروف رہے۔ انہوں نے نظم ونثر میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ شاگردوں کے کلام پر اصلاح دینا، رسائل اوراخبارات کے لئے اداریئے لکھنا، ادبی وشعری نشستوں میں شرکت کرنا، ممتاز رسائل واخبارات کیلئے لکھنا، ان کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ سیماب ۱۹۴۹ء میں پاکستان تشریف لے گئے۔ وہاں بھی علمی وادبی کاموں میں مصروف رہے۔آخری عمر میں اُن پر فالج کا حملہ ہوااوراسی بیماری سے ۱۹۵۱ء میں رحلت کر گئے۔

سیمابؔ اکبرآبادیؔ نے حسب رواج اپنی شعر گوئی کا آغاز غزل سے کیا اوراختتام بھی غزل پر ہی کیا۔ بقول راز چاندپوری:

> ''اُن کی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے ہوئی تھی اوراس کی انتہا بھی غزل گوئی ہی پر ہوئی۔'' (۱)

اس بات کے باوصف کہ شاعری میں اُن کا عشق نظم سے تھا، غزل سے اُن کی دلچسپی کسی دور میں بھی ختم نہیں ہوئی اوراُن کے متعدد شعری مجموعوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اُن کی غزل، ان کی نظم سے کسی طرح بھی کم نہیں البتہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اُس زمانے میں غزل کا بھرم ٹوٹ رہا تھااور نظم کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی جارہی تھی۔

---

(۱) سہ ماہی ''اُردوادب'' علی گڑھ شمارہ ۳، ۱۹۶۷ء، ص۹

اس لئے علامہ نے بھی غزل سے زیادہ نظم کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا اور اسی سبب سے اسے "بے وقت کی شہنائی" اور "بے فصل کا نغمہ" کہا۔ چنانچہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

سیماب غزل گوئی اب اس کے سوا کیا ہے
بے فصل کا اک نغمہ، بے وقت کی شہنائی

سیماب نے غزل میں کچھ اصلاحات کرنا چاہیں جن سے غزل کی لطافت اثر انداز ہو سکتی تھی۔ اس لئے عام طور سے ان کو غزل سے زیادہ نظم کا شاعر کہا گیا لیکن اُس دور میں بھی نیاز فتح پوری جیسے ناقد نے اُن کی غزل گوئی کی تعریف کی تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیماب فطرتاً شاعر پیدا ہوئے ہیں اور اس دور کے اچھا کہنے والوں میں ہیں۔ اگر وہ اپنی شاعری کو صرف غزل تک محدود رکھتے اور نظموں کے خارزار میں نہ اُلجھتے تو زیادہ کامیاب ہوتے اور تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کرنے سے بدرجہا بہتر صرف ایک صنف کو لے کر اس میں کمال پیدا کرنا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اگر سیماب صاحب اپنی توجہ تمام تر غزل پر صرف کرتے تو آج اُن کا مرتبہ دُنیائے شاعری میں اس سے زیادہ بلند ہوتا۔"(۱)

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی قادر الکلامی کے باوجود سیماب اپنی غزلوں میں کوئی انفرادی رنگ پیدا نہیں کر سکے۔ اگرچہ انہوں نے ہر رنگ میں شعر کہے اور کچھ تجربے بھی کئے لیکن عام طور سے وہ اپنی غزلوں میں وہ بات پیدا کرنے سے قاصر رہے جو غزل کا خاص جوہر ہے۔ اکثر نقادانِ فن نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ سیماب کی غزلوں میں لطافتِ احساس کی کمی ہے یا وجدانی تاثر نہیں ملتا ہے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری صحیح لکھتے ہیں:

(۱) نیاز فتح پوری: انتقادیات (حصہ اوّل) ص ۱۹۷

"وہ خود بڑے مشاق شاعر ہیں اور شعر کہنے میں ان کو
مطلق زحمت نہیں ہوتی۔ اُن کے ہاں کافی تعداد اچھے اشعار کی
نکل آتی ہے۔ مگر ان میں کسی خاص جمالیاتی بصیرت یا وجدانی
تاثر کا پتہ نہیں چلتا۔" (۱)

یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ سیماب کی شاعری میں کوئی ذاتی اُپج نہیں ہے۔ اُن کی نظموں میں اُن کی اُپج کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس طرح بات کرنے کے عادی ہیں جس سے قاری کو گمان ہوتا ہے کہ یہ اُس کے دِل کی بات ہے، جو بڑے خوبصورت انداز میں شاعر نے بیان کی ہے۔ سیماب کی نظمیں اصل میں اُن کے جذبے اور احساس کا اظہار ہیں۔ ایک نظم گو کی حیثیت سے اُن کا درجہ بلند و بالا ہے۔ انہوں نے بے شمار نظمیں لکھیں ہیں جو متنوع موضوعات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں شاعرانہ کمال کا احساس ہوتا ہے۔ نظم کے ساتھ اُن کی دلچسپی کا اظہار اُن کے ہی لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعراء
غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اس لئے کہ غزل
جس صنف کا نام ہے وہ اپنی قدامت اور کہنگی کی وجہ سے اب
زیادہ کار آمد نہیں رہی۔ شعرائے متغزلین اس صنف کو بہ تمام
وکمال پامال کر کے ختم کر چکے۔ منتہی شعراء کے لئے غزل میں
اجتہاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے۔ مگر نظم کا میدان ہنوز وسیع
ہے اور یہ صنف سخن اُردو شاعری کو کار آمد اور مفید بنا سکتی ہے۔
اس لئے زیادہ تر توجہ اس کی طرف ہونی چاہئے۔" (۲)

---

(۱) مجنوں گورکھپوری: دوش و فردا (بحوالہ اُردو ادب، شمارہ ۳، ۱۹۶۷ء ص ۱۲

(۲) سیماب اکبرآبادی: کلیم عجم، ص ۳۱

سیمابؔ کی نظمیں موضوعاتی اور تکنیکی اعتبار سے متنوع ہیں۔ انہوں نے اسلامی فکر و فلسفے کے ساتھ ساتھ وطنی، سیاسی اور اخلاقی موضوعات پر لکھا ہے۔ وہ اپنے دور کے بڑے نظم نگاروں میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ شاعری کو جزو پیغمبری سمجھتے ہیں۔ اس لئے شعر کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ شعر کے حسن کا بھی خیال کرتے ہیں۔ سیمابؔ کے موضوعات میں وطنیت اور سیاست کی بڑی اہمیت ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے کئی سیاسی واقعات کو شعر کی زبان میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح تصورِ انقلاب بھی اُن کی بیشتر نظموں میں جھلکتا ہے۔ اُن کی کئی نظموں میں انقلاب روس کی گونج ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اشتراکیت سے بھی کسی زمانے میں متاثر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محنت کش طبقہ کے بارے میں اُن کے شعری مجموعوں میں کئی نظمیں ملتی ہیں۔ سیماب کے یہاں فطرت کی منظر کشی بھی بدرجۂ اتم ملتی ہے جس میں وہ ایک مصور نظر آتے ہیں۔ اُن کی منظر کشی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اُن کی نظم ''فطرت کی جوگن'' کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

عروجِ شب ہائے ماہ کا ہے ضیاء فضاؤں پہ چھا رہی ہے
عروسِ شب بے حجاب ہوکر تجلیوں میں نہا رہی ہے
چمک رہا ہے ڈھلے ہوئے آسمان پر چاند چودھویں کا
ہوس کے بادل ابھی کھلے ہیں فضا کی خنکی بتا رہی ہے
فلک بھی روشن، زمیں بھی روشن، مکاں بھی روشن، مکیں بھی روشن
جہان ہے اور روشنی ہے، نظر جہاں تک بھی جا رہی ہے

(فطرت کی جوگن)

مجموعی طور پر موضوعات کے اعتبار سے سیمابؔ کی نظموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ واقعاتی اور تخیلی نظمیں

۲۔ شاعرانہ اور فلسفیانہ نظمیں

۳۔قومی اور سیاسی نظمیں

۴۔بچوں کی نظمیں

واقعاتی اور تخیلی نظموں کے سلسلے میں اُن کا مجموعہ کلام ''نیستان'' پیش کیا جاسکتا ہے۔ ان نظموں میں سیماب لطیف خیالات اور جذبات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی مٹھاس سے ایک نئی دنیا خلق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''کارِ امروز'' کی نظمیں سیماب کے شاعرانہ اور فلسفیانہ خیالات پر دال ہیں۔ اسی طرح ''ساز و آہنگ'' میں اُن کے دوسرے بے شمار موضوعات ملتے ہیں۔

سیماب کی شاعری کا ایک وقیع حصہ اُن کی رُباعیات پر مشتمل ہے۔ ''عالم آشوب'' اُن کی خوبصورت رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں تقریباً پانچ سو رُباعیات شامل ہیں۔ اُن کی رُباعیوں کا اصل موضوع اُن کے وطنی اور قومی تصورات ہیں۔ یہاں حُسن و عشق کا کوئی دخل نہیں۔ ان رباعیوں میں بیشتر دوسری عالمگیر جنگ سے متعلق ہیں اور رہ رہ کر نازیوں کے ظلم و استبداد کی کہانی سناتی ہیں۔ اگر چہ یہ رُباعیاں پروپیگنڈائی اہمیت رکھتی ہیں اور حکومت کی فرمائش پر لکھی گئی ہیں لیکن پھر بھی اُن کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ فرمان فتح پوری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

> ''ہر چند کہ یہ رباعیاں حکومت کے اشارے پر کہی گئی تھیں اور اُن کا مقصد برطانوی رعایا کے دل سے خوف و ہراس کو زائل کرنا تھا۔ پھر بھی سیماب کو تاریخ و صحافت شعرا کے ڈھانچے میں ڈھالنے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ اکثر رباعیوں میں تاریخی واقعات، عام سیاسی اور قومی مسائل بڑی خوبصورتی سے نظم ہوگئے ہیں اور ان میں صحافتی رنگ کے باوجود ایک طرح کا شاعرانہ حسن پیدا ہو گیا ہے۔''(۱)

(۱) فرمان فتح پوری: اُردو رباعی (فنی و تاریخی ارتقاء) ص ۲۱۱۔۲۱۲

سیمابؔ نے خود اپنے تخلیقی سفر کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ان کی خصوصیات سے بحث کی ہے۔ پہلا دور ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۸ء تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ اُن کا ابتدائی دور ہے۔ اس میں حسن و عشق اور زُلف و رخسار کے مضامین نظم کئے گئے ہیں۔ دوسرا دور ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۸ء پر محیط ہے۔ اس دور میں اُن کے یہاں ہر طرح کے مضامین ملتے ہیں۔ لیکن اکثر غزلیں قافیہ پیمائی کی نذر ہو چکی ہیں۔ تیسرا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک ہے۔ یہ اُن کی مقبولیت کا دور ہے اور طبیعت میں زبردست آمد ہے۔ خود لکھتے ہیں:

"تکلّف برطرف، جہاں اور جب ضرورت ہوئی قلم
جیب سے نکالا اور نظم یا غزل، جو کچھ کہنی ہوتی، کہہ ڈالی"۔ (۱)

چوتھا دور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک ہے۔ یہ سیمابؔ کی شاعری کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس دور کی خصوصیات خود اُن کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

"اب میرا ماحول قطعی روحانی اور مادیات کے تصور سے بھی خالی تھا
اور اب بعض اوقات بغیر فکر بھی شعر دماغ پر نازل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات
تو یہ قطعاً معلوم ہوتا ہے کہ خدا بول رہا ہے اور بندہ لکھ رہا ہے۔" (۲)

اور آخری دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۰ء تک کا ہے۔ اُس زمانہ میں انہوں نے "سازو آہنگ" اور "سدرۃ المنتہیٰ" کی ترمیم کی اور کلام پاک کا منظوم ترجمہ کیا۔

سیماب اکبرآبادی اپنے دور کے ایک اہم شاعر تھے۔ اُن کی شاعری پاکیزہ جذبات سے لبریز ہے اور اس پر ان کے طرزِ بیان کی ندرت سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے تخلیقی سفر میں بہت سے تجربے کئے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ انہوں نے شعر و ادب کی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی۔

(۱) سیمابؔ اکبرآبادی: کلیم عجم بحوالہ سہ ماہی اُردو ادب شمارہ ۳۔ ۱۹۶۷ء ص ۱۶

(۲) سیمابؔ اکبرآبادی: کلیم عجم بحوالہ سہ ماہی اُردو ادب شمارہ ۳، ۱۹۶۷ء، ص ۱۷، ماہنامہ شیرازہ، سرینگر جلد ۳۳، شمارہ ۱۔ ۶
ماہنامہ شاعر ممبئی گوشہ پرتمی رومانی سنہ اشاعت

حفیظ جالندھری ایک مطالعہ

ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ کے بعد جن شعراء نے اپنی فنکارانہ چابکدستی اور خداداد صلاحیت سے اپنا لوہا منوالیا اُن میں حفیظ جالندھری کا نام اہم ہے۔ حفیظ نے غزل، نظم اور گیت جیسے اصناف میں طبع آزمائی کی اور اُردو شعر و ادب میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا۔ اُنہوں نے جہاں ایک طرف اقبال کے رنگِ سخن کو اپنایا وہاں دوسری طرف اکبرالٰہ آبادی، چکبست لکھنوی اور اختر شیرانی جیسے شعراء سے بھی اکتسابِ فیض کرلیا اور اپنی تخلیقات میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کر کے ان میں ایک نئی اور انفرادی بات پیدا کی۔

محمد حفیظ خاندانی نام، تخلص حفیظ، کنیت ابوالاثر ۱۴؍جنوری ۱۹۰۰ء کو جالندھر پنجاب میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد حافظ شمس الدین تھے۔ اُن کا خاندان مسلمان راجپوتوں کا خاندان ہے، جو مسلمان ہو جانے کے باوجود رانا کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ حفیظ جالندھری خود اپنے خاندان کے بارے میں ایک جگہ پر رقمطراز ہیں:

> "میرا خاندان تقریباً دو (۲۰۰) برس پیشتر چوہان راجپوت کہلاتا تھا۔ میرے بزرگ ہندو سے مسلمان ہو گئے اور پاداش میں اپنی املاک وغیرہ کھو بیٹھے۔ البتہ سورج بنسی ہونے کا غرور مسلمان ہونے کے باوجود ساتھ رہا، میری ذات تک پہونچا اور ختم ہو گیا۔" [1]

۱) ماہنامہ "نگار" لکھنؤ، جنوری و فروری ۱۹۴۱ء، جلد ۳۹، شمارہ ۱-۲، ص ۱۳

حفیظ نے ابتدائی تعلیم جالندھر کی حوض والی مسجد میں حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں مشن ہائی اسکول کی پرائمری شاخ میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ دوآبہ آریہ اسکول میں بھی تعلیم پاتے رہے۔ شروع سے ہی شعر وشاعری اور قصے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ باقاعدہ تعلیم ساتویں جماعت تک حاصل کی اور پھر اسکول اور گھر دونوں کو ترک کر دیا۔ خود اپنے ذوق کو اپنا رہنما بنایا اور اُردو، ہندی، فارسی اور انگریزی میں اچھی استعداد حاصل کی۔ فارسی میں مولوی سید احمد علی شاہ سے خاصا فیض حاصل کیا۔

داغؔ دہلوی، مومنؔ، کبیر داس، حسن نظامی، سر عبدالقادر، سر راس مسعودؔ، سجاد حیدر یلدرمؔ، بابا خلیل راس چترویدی (۱) ان کے معنوی اُستاد ہیں، جن سے انہوں نے خاصی بصیرت حاصل کی۔ 1915ء میں ٹائم کیپر کی حیثیت سے ۲۲ روپے ماہانہ پر ریلوے میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۱۶ء میں جالندھر میں عطر کی دکان کھولی پہلی جنگِ عظیم کے دوران فوجی وردیوں کی تیاری کا ٹھیکہ لیا۔ کچھ وقت سنگر کمپنی کے مینجر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ آئی اینڈ بی میں ملازم ہوئے اور سانگ پبلسٹی کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کے ایماء پر پاکستان مسلح افواج میں ڈائریکٹر آف موریل کی حیثیت سے ۱۹۵۲ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔

حفیظ شروع سے ہی صحافت کے ساتھ دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کئی رسالے اور اخبارات جاری کئے۔ بعض دوسرے اخبارات کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ ان میں سے خاص طور پر شباب (لاہور)، زمیندار، تبلیغ، ہزار داستان، نونہال، پھول، تہذیب النساء، حمایت الاسلام، مخزن، کارزار وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حفیظؔ کو وقتاً فوقتاً مختلف اعزازات اور خطابات سے بھی نوازا گیا۔ انہوں نے شعر وادب میں کافی خدمات انجام دیں۔ پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کا شرف حفیظ صاحب کو ہی حاصل ہوا۔ حفیظ زندگی کی ۸۲ر

۱) ماہنامہ ''افکار'' (حفیظ نمبر) شمارہ ۱۴۴۔۱۴۵۔۱۴۶۔ اگست ستمبر اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص ۳۶

بہاریں دیکھنے کے بعد ۱۹۸۲ء میں لاہور میں وفات پا گئے۔

حفیظ کو لڑکپن سے ہی نعت خوانی کا شوق تھا اور بڑے شوق سے قوالی کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں جو کچھ انہوں نے سُنا، اس سے وہ متاثر ہوتے رہے۔ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے پہلا شعر کہا

محمدؐ کی کشتی میں ہوں گا سوار

تو لگ جائے گا میرا بیڑا پار

شاید اسی شعر کے بارے میں حفیظ نے خود لکھا ہے:

"عمر کے ساتویں برس میں ایک دِن راہ چلتے ایک محفل دیکھی جس میں، جبکہ بزرگوں کی زبانی بعد میں معلوم ہوا، مشہور فارسی شاعر گرامی اپنا فارسی کلام سنا رہے تھے اور لوگ واہ واہ کر رہے تھے۔ دوسرے دِن کاٹھ کی تختی پر ہم نے اپنی پہلی نظم لکھ ڈالی۔ جس کو دیکھ کر ہمارے اُستاد نے ہمیں گدھا وغیرہ بنایا اور دو چار چپت بھی رسید کئے۔" (۱)

یہ سات سال کے بچے کا شعر تھا۔ یہی شعور آہستہ آہستہ نکھر گیا اور ایک وقت ایسا آیا وہ برصغیر کے بڑے شاعروں میں گنے جانے لگے۔ ۱۹۱۱ء میں جب وہ چھٹی جماعت کے طالب علم تھے، اُنہوں نے اپنی پہلی غزل لکھی تھی، مطلع تھا

خواب میں دلدار کی تصویر ہم نے دیکھ لی

رات کو جاگی ہوئی تقدیر ہم نے دیکھ لی

۱۹۱۱ء میں جالندھر کے ایک اسکول کے مُدرّس سرفراز خان سرفرازؔ کو اپنی چند غزلیں دکھائیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے ساتویں جماعت کے بعد ہی تعلیم کو ترک کیا اور شعر گوئی کی طرف پوری دلچسپی کے ساتھ مائل ہوئے۔ جالندھر میں اُن دنوں میں فارسی کے

(۱) سہ ماہی "صحیفہ" (۲۶واں شمارہ) جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۸۷

مسلم الثبوت شاعر مولانا گرامی مشاعروں میں دھوم مچا چکے تھے اور حیدر آباد کے دربار کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے۔ چنانچہ حفیظ نے اُن کی طرف رجوع کیا لیکن حضرت گرامی نے مشورہ دیا کہ وہ اپنے کلام کو خود دیکھ لیں اور انہوں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ اس کی طرف خود اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ اپنا کلام حضرت گرامی کی خدمت میں دکن ارسال کروں اور اصلاح چاہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور چند غزلیں اُن کی خدمت میں ارسال کیں۔ جواب ملا "گرامی فارسی کا شاعر ہے اُردو سے بہت دُور، حفیظ جوہرِ قابل معلوم ہوتا ہے۔ حفیظ کو چاہیئے کہ اپنا کلام بار بار خود ہی ناقدانہ نظر سے دیکھا کرے، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس مشورہ پر عمل شروع کیا۔" (۱)

اور اس کے بعد اپنے ذوق کو ہی اپنا استاد بنایا۔

حفیظ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادرا کلامی کا ثبوت دیا ہے۔ غزل نظم، مسدس، گیت، بچوں کی نظمیں، ہر صنف میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ اُن کی اہم تصانیف میں نغمۂ زار، سوز و ساز، تلخابہ شیریں، شاہنامۂ اسلام، حفیظ کے گیت اور نظمیں، ہندوستان ہمارا اور نثر میں ہفت پیکر، معیاری افسانے، انتخابِ حالی معہ مقدمہ اور متفرقات میں منظوم تاریخ پاکستان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حفیظ کو پاکستان کا قومی ترانہ لکھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اُردو میں آسان زبان میں گیتوں کو رواج دینے کی اوّلیت بھی انہیں حاصل ہے۔ اُردو نظم میں انہوں نے تکنیک کے تجربے بھی کئے۔ چنانچہ اُن کی نظم "فرصت کی تلاش" اُن کا ایک انوکھا تجربہ ہے جس میں انہوں نے قدیم شعری اصولوں سے یکسر بغاوت کی اور عرصہ دراز تک اُنہیں اہل لکھنؤ بے تکا شاعر کہتے رہے۔ (۲)

---

(۱) ماہنامہ "نگار" لکھنؤ جلد ۳۹، شمارہ ۱۔۲، ص ۱۱۵۔۱۱۴

(۲) ماہنامہ "افکار" (حفیظ نمبر) شمارہ ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶ / اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۱۰

حفیظ جالندھری اُس زمانے میں اُبھرے جب اکبر الٰہ آبادی، چکبست، اقبال، جوش، اختر شیرانی، حسرت موہانی، فانی، یگانہ، اصغر وغیرہ آسمانِ ادب پر طلوع ہو چکے تھے۔ اُن میں سے بیشتر لوگ ادبی دُنیا میں مشہور ہو چکے تھے۔ حفیظ نے پے در پے نغمۂ زار، سوز وساز اور شاہنامہ اسلام کی چار جلدیں ایک دوسرے کے بعد منظر عام پر پیش کر کے ایک دھوم مچا دی۔ حفیظ نے شروع شروع میں جن شاعرانہ خوبیوں سے لوگوں کی توجہ مبذول کی، اُن میں اُن کا مترنم، چھوٹی چھوٹی بحروں کا استعمال، موسیقیت خاص طور پر اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے ایک چونکا دینے والی کیفیت پیدا کر دی۔ ایسی شاعری میں وہ نہ کسی سے متاثر نظر آتے ہیں اور نہ کسی کی تقلید کرتے ہیں۔ فراق گورکھپوری نے آج سے کوئی اسّی سال قبل لکھا تھا کہ حفیظ جالندھری کے گیتوں اور ترانوں میں جتنی تاثیر، سادگی اور ٹھوس پن ملتا ہے اس کا جواب کہیں اور نظر نہیں آتا لکھتے ہیں:

> ''آواز کی یہ طیاری، یہ اُبلتی ہوئی جوانی، یہ بے تکلف اور بے لاگ رچاؤ اور نکھار، یہ شوخ اور چٹیلی رنگینی، یہ دھن، یہ سُریلا پن، یہ رنگ، یہ رس، یہ کسک اور یہ انگڑائیاں ہمیں آج تک کسی اُردو شاعر میں اور کہیں نہیں ملتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصرعے اور اشعار کہے نہیں گئے ہیں بلکہ چھلک پڑے ہیں۔ حفیظ کی منظر نگاری خاص توجہ کی مستحق ہے۔'' (۱)

حفیظ کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت جس کی طرف فراق نے اشارہ کیا ہے، اس کی موسیقی اور نغمگی ہے، حفیظ شاعری اور موسیقی کے رشتے سے واقف ہیں اور وہ کولرج کی اس بات سے متفق نظر آتے ہیں کہ شاعری بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب ہے۔ ان کے فن کی سب سے بڑی خوبی شعر اور نغمے کا لطیف توازن ہے۔ سید ضمیر جعفری صحیح لکھتے ہیں:

---

(۱) ماہنامہ ''نگار'' اکتوبر ۱۹۴۱ء، جلد ۴، شمارہ ۴، ص ۳۶

"ایک لطیف ومتوازن نغمگی اُس کے آرٹ کا سب سے بڑا حسن ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ حواس میں بہتی ہوئی ایک بے نام لذت کو اُس کی پوری مٹھاس، رس اور لوچ کے ساتھ اشعار میں نچوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ گاتے ہیں۔ مصرے گنگناتے ہیں۔ نرم رواں دواں کوئی ٹکڑا اٹکتا نہیں۔ کوئی لفظ کھٹکتا نہیں۔(۱)

نغمۂ زار سے تلخابہ شیریں تک حفیظ نے ایک طویل تخلیقی سفر طے کیا ہے۔ شروع کی غزلوں میں داغ کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس لئے شوخی کے ساتھ ساتھ سادگی اور صفائی بھی نظر آتی ہے۔ حفیظ نے داغ سے نہ صرف اسلوب کا رنگ سیکھا بلکہ زبان کی نزاکت کی پاسداری کا رنگ بھی اُنہی سے حاصل کیا لیکن جہاں تک غزل کی روح کا تعلق ہے وہ حفیظ کی اپنی ہے۔ حفیظ نے حتی الوسع معاملہ بندی سے پرہیز کیا اور اس کے برعکس فکر کی پاکیزگی کو اپنی شاعری میں برتا۔

سوز وساز میں معاملہ کچھ مختلف ہے۔ اب اُن کی فکر گہری ہوتی چلی جارہی ہے۔ لہجے کی تازہ کاری برقرار ہے یعنی انداز وہی آسان، سادہ اور رسیلہ ہے لیکن اس کے برعکس خیالات میں گہرائی نہیں ہے۔ "تلخابہ شیریں" میں تلخیاں نظر آتی ہیں اور اس کا سبب دوسری عالمگیر جنگ ہے۔ اسلوب میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن طنز کا رنگ بڑھ گیا ہے۔ یہ طنز اور تلخی دراصل حالات کی پیدا کردہ ہے جس کے وسیلے سے حفیظ نے اپنے محسوسات کا اظہار کیا ہے۔ اس طویل سفر میں شاعر نے جو مشاہدے کئے اور جن تجربوں سے وہ گزرے، اُن سے اُسے آگہی اور ادراک حاصل ہوا۔ اس کا ذکر خود ہی تلخابہ شیریں کے مقدمے، بقلم خود میں یوں کرتے ہیں:

"نغمہ زار کا دور لڑکپن سے عنفوان شباب تک کا زمانہ تھا۔ سلسلۂ مشق اور اظہار اُن تاثرات واحساسات کا تھا جن کی

(۴) ماہنامہ "افکار" (حفیظ نمبر) اگست، ستمبر، اکتوبر، ۱۹۶۳ء، شمارہ ۱۴۴، ۱۴۵،

ہر بات انوکھی، سہانی اور خوشگوار تھی .... بے فکری، خود نظری، لطافت، نزاکت .... ٹھنڈی ہوائیں، کالی گھٹائیں .... سوز و ساز کے ڈانڈے بھی اسی سے ملتے جلتے۔ یہاں جیسے گرد و پیش کے دھندلے پن سے یکا یک ایک شعلہ بھڑکے، پردے اٹھ جائیں۔ ہر منظر پیش نظر ہو .... لیکن تلخابۂ شیریں کیفیات میں "نغمۂ زار" اور "سوز و ساز" دونوں سے الگ ہے۔ اس میں انفرادی اور فطری انانیت کا نشہ اُتر چکا ہے۔"(۱)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظؔ نے اپنے تخلیقی سفر میں کن منزلوں کو چھوا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

او دل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھ کو بھی سمجھاتا جا

⊙

ناکامیٔ عشق یا کامیابی   دونوں کا حاصل خانہ خرابی

⊙

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

⊙

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
میرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے
کرتا ہے تصور تیرا اس رنگ کی باتیں
سُن لے کوئی اِک حرف تو افسانہ بنا دے

⊙

---

(۱) حفیظ جالندھری: تلخابہ شیریں ص ۲۴۔۲۲

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ دور کے گیت گا سکے

⊙

میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے
اک اور زندگی کی تمنا لئے ہوئے

⊙

ذوقِ نگاہ کے سوا، شوقِ گناہ کے سوا
مجھ کو بتوں سے کیا ملا، مجھ کو خدا نے کیا دیا

⊙

حفیظ کا ایک اہم کارنامہ ''شاہنامۂ اسلام'' ہے جو چار جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ اس نظم میں تاریخ اسلام کے اہم واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ نظم کا اسلوب جداگانہ ہے۔ اس میں حفیظ کا منفرد رنگ جھلکتا ہے۔ حفیظ نے حقائق کے ساتھ ساتھ تخیل سے بھی کام لیا ہے۔ انہوں نے شاہنامہ میں نہ صرف بندگانِ اسلام کی خوبیاں بیان کی ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہر ایک بات اسلامی تعلیمات کے سیاق وسباق میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے بیان کے حسن کے باعث یہ نظم رزمیہ شاعری کے زمرے میں شامل ہوتی ہے۔

حفیظ جالندھری کے کلام کی ایک بڑی خوبی اس کی تاثیر ہے۔ مضمون میں کتنی ہی پیچیدگی کیوں نہ ہو، حفیظ جو الفاظ اور انداز اختیار کرتے ہیں اس سے نظم میں ایک عجیب لچک پیدا ہوتی ہے۔ غزل کے میدان میں حفیظ کا تخیل بھی داد دینے کے لائق ہے۔ مضامین کا اس قدر تنوع اپنی مثال آپ ہے، کہتے ہیں ۔

وہ عندلیب گلشن معنی ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

حفیظ کی غزل اگرچہ ہیئت کے اعتبار سے روایتی ہے مگر اس میں اُن کا مخصوص رنگ نظر

جھلکتا ہے۔ دراصل موضوع کے اعتبار سے خیال اور احساس کی ندرت جس طرح حفیظ نے غزل میں سمودی ہے، وہ اُن کا ہی کام ہے۔ انہوں نے اپنے تخیل سے غزل کی سطح بلند کردی ہے۔ حفیظ کی غزل زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ اس میں سادگی اور فطری پن پایا جاتا ہے۔ حفیظ نے اپنے تجربوں کی بنیاد پر اپنی غزلوں میں ایک نیا انداز پیدا کردیا ہے۔ زبان وبیان کے اعتبار سے حفیظ کے ہر دور کی غزلیں ایک خاص انفرادیت رکھتی ہیں۔ یہ نغمہ اور آہنگ کا ایک خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہیں۔ پروفیسر صدیق حکیم ان کی شاعری کو شبابیات کی شاعری کہتے ہیں۔ حفیظ کی غزلوں میں یوں تو عشقیہ جذبات پائے جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں فلسفیانہ بُو باس بھی محسوس کی جاتی ہے:

حفیظ کے گیت کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ وہ پہلے اُردو شاعر ہیں جنہوں نے گیت کی صنف کو زندگی سے ہمکنار کیا۔ دراصل ان کی صوتی ہم آہنگی اور گھلاوٹ نے، جواُن کی ہر صنف شاعری میں نظر آتی ہے، ان کے گیتوں کو جنم دیا۔ حفیظ کے گیتوں کا کمال یہ ہے کہ وہ اس گھلاوٹ کو پیدا کرنے کے لئے صرف ٹھیٹھ ہندی الفاظ ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ سبک اور نرم فارسی اور عربی کے الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ گیتوں میں موضوعی اعتبار سے بھی فکر و تخیل کی بلندی ملتی ہے۔ چند گیتوں کے اقتباسات

(۱)

کاٹھ مرلی والے نند کے لال — بنسری بجائے جا بنسری بجائے جا
پریت میں بسی ہوئی اداؤں سے — گیت میں بسی ہوئی صداؤں سے
برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا — سنائے جائے، سنائے جا
کاٹھ مرلی والے نند کے لال — بنسری بجائے جا، بنسری بجائے جا

(گیت: کرشن بنسری)

(۲)

دریا میٹھے، سمندر کھاری — سب میں تیرا فیض ہے جاری

راجا پرجا سب کھاتے ہیں میٹھا اور نمک سرکاری
تیرے ہی گن گاتے ہیں سب آبی، خاکی، نوری، ناری
اپنے اپنے رنگ میں تجھ کو دیکھ رہی ہے دنیا ساری
مسجد میں بھی تیرے نمازی مندر میں بھی تیرے پُجاری
دین بھی تیرا دھرم بھی تیرا اس سے کوئی نہیں انکاری

اس سے کون کرے انکار
تو ہی سب کا پالن ہار

حفیظ کا ایک اور کارنامہ بچوں کی شاعری ہے۔ وہ بچوں کے ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچوں کو نصیحت بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اخلاقی درس بھی دیتے ہیں اور اس طرح سے اُن کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی بچوں کی سطح پر اُن کے ساتھ کھیلنے میں مصروف نظر آتے ہیں جب بھی انہیں موقعہ ملتا ہے تو بچوں کے اخلاق اور اعمال کی تہذیب کرنے سے نہیں چوکتے۔ وہ بچوں کی فطرت سے واقف ہیں۔ اس لئے ان کے دل میں محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے خود بھی بچے بن جاتے ہیں۔

حفیظ جالندھری کے کلام کا ایک اجمالی جائزہ لینے کے بعد یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ایک سچے فنکار ہیں اور نہ صرف یہ کہ ان کی شاعری ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے اہم ہے بلکہ موضوعات کے لحاظ سے بھی اُن کے یہاں رنگا رنگی اور تنوع ہے۔ حفیظ کی شاعری میں سب سے بڑا حسن ان کی غنائیت ہے جو اپنی مترنم لَے، رس اور لوچ سے پڑھنے والوں کو اس قدر متاثر کرتی ہے کہ انہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور یہی امتزاج اُن کو ایک اہم شاعر بناتا ہے۔

OOO

اختر الایمان کی شاعری اور نیا آہنگ

اختر الایمان نے اپنے معاصرین شعراء پر قابل قدر اثر چھوڑا ہے ان سے پہلے میراجی اور ن۔م۔راشد نے اپنے فنی رکھ رکھاؤ اور اسلوب بیان کی تازگی سے جدید نظم کی ارتقائی منزلوں کو چار چاند لگا دیئے لیکن اختر الایمان نے ان سے ایک قدم آگے جا کر اپنے شعور کی بالیدگی اور ذہن کی پختگی سے اردو کی جدید شاعری میں انقلاب پیدا کیا اور ہیت واسلوب کے لحاظ سے نئے تجربے کئے اور شعوری طور پر نظم کے تعمیر حسن کو فراوانی بخشی۔اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب بنتِ لمحات کے نام سے ان کا مجموعہ کلام منظر عام پر آگیا۔ اس مجموعہ کلام سے پہلے گرداب، تاریک سیارہ، آب جُو، یادیں، وغیرہ شائع ہو کر ادبی دنیا میں بحث کا موضوع بن چکے تھے۔نیا آہنگ، ان کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔

اختر الایمان کا وطن یوپی ہے۔یہیں ان کا بچپن گزرا۔دلی کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی جہاں سے ترقی پسند شعراء کی ایک نمائندہ نسل سامنے آئی مجاز، جاں نثار اختر جذبی، سردار جعفری اور منیب الرحمٰن وغیرہ اسی دور میں شہرت کے آسمان کو چھونے لگے۔ اختر الایمان بھی انہیں شعرأ میں نمایاں طور پر نمودار ہوئے۔ان کے ایک طرف یوپی کا ماحول تھا اور دوسری طرف دلی اور علی گڑھ جیسے بڑے شہروں کی تیز رفتار زندگی کا ایک طرف مشینی دور کی برق رفتاری اور دوسری طرف نچلے طبقے کے لوگوں کی افلاس زدہ زندگی اور تقسیم ملک کا المیہ، اس ماحول نے اختر الایمان کی شاعری اور ان کی شخصیت پر گہرے نقوش

چھوڑے اور یہی دکھ درد غربت، افلاس، سماجی پسماندگی، ہندوستانی معاشرت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کا عکس وہ اپنی شاعری میں انڈیلتے رہے۔ 'نیا آہنگ' ایک بار پھر اسی کی روداد پیش کرتا ہے جس کا اعتراف خود اختر الایمان یوں کرتے ہیں:

"میری شاعری کیا ہے؟ اگر ایک جملے میں کہنا چاہیں تو میں اسے انسان کی روح کا کرب کہوں گا۔ یہ کرب مختلف اوقات میں مختلف محرکات کے تحت الگ الگ لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے۔"

'نیا آہنگ' میں شامل نظمیں اختر الایمان کے نئے تجربات، احساسات اور محسوسات سے لبریز ہیں۔ اس میں اُن کی چند ابتدائی نظمیں بھی شامل ہیں جو مختلف اوقات پر مختلف جرائد میں چھپ چکی ہیں۔ اُمید اور بیٹے نے کہا، اگرچہ اختر کی ابتدائی نظمیں ہیں لیکن رنگ و آہنگ موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے یہ نظمیں کافی اہمیت کی حامل ہیں اور اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتی ہیں نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

تارے ماند پڑتے ہیں
شب کے تیرہ آنگن میں
چاند مسکراتا ہے
نور کا فرستادا
برف کی طرح ٹھنڈا
دیکھ کر یہ منظر میں
سوچتا ہی رہتا ہوں
اپنے جی میں کہتا ہوں
میری صبح فردا بھی شائد ایسی روشن ہے۔ (اُمید)

یا

بیٹے نے باپ سے پوچھا عجب انداز کے ساتھ
پھر یہ کیوں ہے کہ اندھیرا ہے ہمارے گھر میں
اوراس گھر میں ابھی تک بھی دیا جلتا ہے!

(بیٹے نے کہا)

'نیا آہنگ' کی بیشتر نظمیں علامتوں سے مالا مال ہیں۔اختر الایمان نے علامتوں کا استعمال کر کے جدید نظم نگاری کو ایک اہم موڑ دیا ہے ۔ یہ علامتیں اکثر پیکروں کی شکل اختیار کر کے انسان کو دور فضاؤں میں لے جاتی ہیں اور زبان و بیان کی لطافت میں مقید ہوکر قاری کو بار بار جھنجھوڑنے کا سامان بہم کرتی ہیں ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان کواس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ پیچیدہ تجربات اوراحساسات کو بیانیہ انداز میں پیش کرنے کے روادار ہی نہیں بلکہ وہ علامتی اسلوب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ تمام شعری لوازمات کا بھی خیال رکھتے ہیں ۔علامتوں کا بے جا استعمال زبان و بیان کا انفرادی رنگ ،فنی رکھ رکھاؤ ،تشبیہات و استعارات کا انوکھا استعمال اوراسلوب کا نرالا انداز ان تمام خصوصیات کا جائزہ، نیا آہنگ ،پیش کرتا ہے۔اس طرح سے ان کی نظموں میں نئے پیکر وجود میں آتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اختر نے نئے نئے موضوعات کا انتخاب کر کے اپنی نظموں کو نئی تیکنیک سے جدید آہنگ بخش دیا ہے۔زبان و بیان اوراسلوب ان نظموں کو ایک الگ روح پھونک دیتی ہے مثلاً۔

میرا پڑوسی بڑا پیارا آدمی تھا، اسے
گلی میں آن کے آواز دی ''غلام رسول!''
معاً مجھے یاد آیا میرا پیارا ہمسایہ
کبھی کا بن چکا بیچارہ اڑتے وقت کی دھول۔(پکنک)

شہر سب ایک سے ہوتے ہیں کہیں
قحبہ خانے ہیں بہت اور کہیں رہنما
ڈھیرے سے یا لوگ جرائم پیشہ
مختصر یہ ہے کہ بے چاری یہ اللہ کی زمین
اپنی گردش کے علاوہ بھی ہے مجبور بہت
(قدرِ مشترک)

'نیا آہنگ' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اختر الایمان کی نظموں میں کائنات کے مسائل، سماجی نابرابری، معاشی بدحالی اور زندگی کی پیچیدگیاں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اختر کی نظموں میں احساس اور فکر کی ہم آہنگی براہ راست پائی جاتی ہے۔ وہ انسان کا درد و کرب محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زمین سے تا فلک تمام کائنات ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک انسان کو فقط دو وقت کی روٹی، سر چھپانے کو چھپر اور ایک عورت کی ہی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر باہر کی فضاؤں میں بھی سانس لینا ہے۔ وہ زمانہ بیت چکا ہے جب ایک انسان ذہنی سماجی اور تعلیمی لحاظ سے بہت پست تھا۔ اب وہ چار دیواری کے قیود سے نکل کر وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ کر تمام مشکلات کا مقابلہ کرنے لگا ہے۔ اپنی نظم 'آثار قدیمہ' میں انہوں نے اسی تاثر کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے

برتن، سکے، مہریں، بے نام خداؤں کے بت ٹوٹے
پھوٹے مٹی کے ڈھیروں میں پوشیدہ چکی چولہے کند اوزار
زمینیں جن سے کھودی جاتی ہوں گی کچھ ہتھیار جنہیں استعمال
کیا کرتے ہوں گے مہک حیوانوں پر کیا بس اتنا ہی ورثہ ہے
میرا انسان یہاں سے جب آگے بڑھتا ہے کیا مر جاتا ہے؟

'راہ فرار' اختر الایمان کی اہم نظم ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے وطن عزیز کی تاریخ

کے مختلف ادوار کا محاکمہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ بدنصیب ملک تاریخ کے مختلف ادوار میں کس طرح ظالموں کی چیرہ دستیوں کا شکار رہا۔ یہ ملک بار بار لٹا اور بار بار اس کی آبرو تار تار ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہو یا نادر شاہ کا قتل عام، انگریزی سامراج کی شاطرانہ چالیں ہوں یا ہندوستان کا بٹوارہ۔ یہ سب قصے ہماری میراث بنے ہے۔ اختر کو اس میراث کو اپنانے سے عار نہیں کیونکہ یہ اس کے جسم و جان کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ 'راہ فرار' میں اختر الایمان نے حال اور مستقبل کے ایسے ہی مسائل کی چاپ سن لی ہے۔ وہ ایسی نسل کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کی سکت نہیں۔ وہ ان تلخ واقعات اور مسائل کی تکرار کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے سم قاتل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی آگہی ضروری ہے اختر کی یہ نظم علامتی ہے۔ وہ دراصل ایک منفی انداز اختیار کر کے ان واقعات کی تلخیاں واضح کرتے ہیں۔ راہ فرار اختیار کر کے اختر الایمان دراصل ان زخموں کے ٹانکوں کو کھول دیتے ہیں جو ان کے دل پر لگے ہیں اور وہ زخموں کے یہ پھول اپنی نسل کو پیش کرتے ہیں تاکہ ان میں بھی آگہی اور ادراک کا شعور پیدا ہو اور وہ ایک بہتر زندگی کی راہ تلاش کریں۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

ادھر سے نہ جاؤ
کوئی راہ میں روک لے گا
نیا کوئی خطرہ نیا مسئلہ کوئی جس کا
نہ سوچا نہ سمجھا نہ احساس ہے جس کا اب تک
کوئی ایسی صورت نکالو
یہ سب آفتیں اپنا دامن نہ پکڑیں
کوئی اور راہ فرار ایسی ڈھونڈو
کہ ہم زندگی کے جہنم کو جنت سمجھ لیں۔

اختر الایمان کے کلام میں خود کلامی کا جذبہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اکثر جگہوں پر وہ خود

سے ہم کلام ہوتے نظر آتے ہیں۔ ان میں خیالات احساسات اور جذبات کو محسوس کرنے کا جو انوکھا انداز ملتا ہے۔ یہ ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت ہے۔ وہ ہنگاموں، جنگ وجدل اور خون ریزی سے کسی شخص، چیز یا معاملے پر قابو پانے کے عادی نہیں بلکہ محبت، خلوص اور شفقت سے حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں مثلاً۔

اٹھاؤ ہاتھ کہ دست دُعا بلند کریں
ہماری عمر کا ایک اوردن تمام ہوا
خدا کا شکر بجالائیں آج کے دن بھی
نہ کوئی واقعہ گزرا نہ ایسا کام ہوا
زبان سے کلمۂ حق راست کچھ کہاجاتا
ضمیر جاگتا اور اپنا امتحان ہوتا

(شیشے کا آدمی)

گر ہم کبھی پلٹ کے یہاں آئے اوراس
صحرا کی زندہ ریت نے بستی کو کھالیا
سب اپنے جھنڈے ہر جگہ لہراتے پائیں گے
ہم ان کے نیچے پرکھوں کی قبریں بنائیں گے

(مداوا)

اختر الایمان نے مختصر نظموں کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے، 'نیا آہنگ' میں بھی چند نظمیں ایسی دیکھی جاسکتی ہیں۔ قدر مشترک تادیب، نیا آہنگ، گریز، ایک کیفیت، لطیفہ وغیرہ قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ان نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی ایک نئی مثال قائم کی ہے۔ اس کا پرتو آج کل کے بیشتر لکھنے والوں میں نظر آتا ہے، شہر یار، محمد علوی، عادل منصوری وغیرہ کے ہاں اختر الایمان کی مختصر نظموں کے واضح اثرات دیکھنے میں آتے ہیں۔

سب رنگ، کے عنوان سے 'نیا آہنگ' میں اہم نظم ملتی ہے۔ یہ ایک منظوم ڈرامہ ہے جس میں مختلف کردار نظر آتے ہیں، وقت کا خیال بھی ہے اور زمان ومکان کا تصور بھی مکالمے بھی اور منظر کشی بھی لیکن ڈرامے کے کردار حیوانات مقرر کئے گئے ہیں۔ جنہوں نے اپنا اپنا رول بڑی خوبی اور دیانتداری سے نبھایا ہے۔ نظم سب رنگ، علامتوں سے مالا مال ہے۔ اور طنز ومزاح سے بھرپور بھی۔ اختر نے علامتوں کے ذریعے سے اپنی نظموں میں انگریزوں کے سفاکانہ اور ظالمانہ پن کو بے نقاب کردیا ہے۔ یہ بات پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ ۱۹۴۷ء کا المیہ اختر کے لئے نا فراموش واقعہ ہے اور اس المیے کا گھاؤ اتنے برس گزرنے کے بعد بھی ان کے دل میں تازہ ہے۔ یہ نظم ۱۹۴۳ء کی ہے اور ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ نظم کے ابتدائیہ میں اختر الایمان نے اپنی اسی ڈراما نما نظم سے قارئین کا تعارف کیا ہے۔ انہوں نے اس منظوم ڈرامے کا مقام براعظم ایشیا کا ایک جنگل رکھا ہے۔ تماشائی شجر حجر وقت اندھیرے اجالے کے درمیان اور زمانے کی قید نہیں رکھی ہے۔ 'سب رنگ کا تعارف بہ ذات خود چند علامتیں پیش کرتا ہے۔ اس نظم کو اختر الایمان نے کئی رنگوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے رنگ کا تعارف وہ یوں کراتے ہیں۔

"ابتداء میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے، ایک ہی قوم وجماعت تھے۔" (کتاب الحکمت)

دوسرے رنگ کا تعارف یوں ہو رہا ہے۔

"اچھے شوہروں کی رائے ہے کہ حسن عموماً بنجر زمین کی مانند ہوتا ہے۔ نہایت شاداب زمینوں میں کچھ برے ٹکڑے بھی نکل آتے ہیں۔" (جان ڈف)

منظوم ڈرامے کے تیسرے رنگ کا تعارف یوں کراتے ہیں:

"اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں کہ گو ایمان کا دعویٰ

کرتے ہیں مگر فی الحقیقت مبتلائے شرک ہیں۔"

(کتاب الحکمت)

آخر میں چوتھے رنگ کا تعارف یوں کراتے ہیں:۔

"مجھے کتوں نے گھیر لیا ہے شیطنیت نے احاطہ کرلیا ہے۔
میرے ہاتھ اور پاؤں گھائل ہوگئے ہیں۔ میرے رفیق مجھے
ان کتوں سے رہائی دِلوا۔" (انجیل مقدس)

'نیا آہنگ' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختر الایمان عصر حاضر کے مسائل سے پوری طرح آشنا ہیں ان کی شاعری پرانے اور دقیق خیالات کی ترجمان نہیں بلکہ ان کی شاعری میں زندگی کے نئے تجربات کا احساس ہوتا ہے۔ اختر الایمان کے زیر بحث مجموعہ میں عجیب کیف، گداختگی تڑپ اور گھلاوٹ ہی نہیں ملتی ہے بلکہ ہندوستانی کلچر، تمدن اور تہذیب کا ایک خاص رچاؤ بھی ان کے کلام میں بہ درجہ اُتم ملتا ہے۔ اسی وجہ سے اُن کا نام جدید اُردو شاعری کے علمبرداروں میں شامل ہوتا ہے۔

('ماہنامہ سیارہ' لاہور، اشاعت خاص۔ جلد ۵۴، شمارہ ۴۳۵، مئی جون ۱۹۸۸ء)

قتیل شفائی کے گیت

قتیل شفائی ایک منفرد انداز کے شاعر ہیں۔ انہوں نے غزل اور نظم کے علاوہ گیت بھی تخلیق کیے ہیں۔ شعر وشاعری کی ان تمام اصناف میں اُن کی رنگا رنگ شخصیت نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ ان کا لب ولہجہ صاف ستھرا اور سلجھا ہوا ہے۔ اسی لئے اُن کی شاعری خصوصاً ان کے گیت بہت مقبول ہیں۔ قتیل شفائی نے اس زمانے میں اپنی شاعری کا آغاز کیا جب شاعرِ رومان اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا بول بالا تھا اور ان کی نظموں کا کردار سلمٰی اس زمانے میں توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔ رومانی نظموں کی یہی کیفیت قتیل کے ذہن ودل پر حاوی رہی اور اسی لطافت اور حسن نے ان کی شاعری کو جنم دیا۔ وہ جہاں اقبالؔ، جوشؔ اور فراقؔ کی شاعری سے خاص طور پر متاثر ہیں وہاں انہوں نے اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی اور ن، م راشد کا اثر بھی داخلی طور پر قبول کرلیا ہے چنانچہ ایک جگہ خود رقمطراز ہیں۔

"اقبالؔ، جوشؔ، فراقؔ، اختر شیرانیؔ، احمد ندیم قاسمیؔ،
ن۔م راشد نے مجھے بے حد متاثر کیا۔" (۱)

قتیل نے اپنی شاعری میں کئی نئے تجربے کیے ہیں۔ یہ تجربے ان کے گہرے مشاہدات اور داخلی اور خارجی واقعات پر مبنی ہیں اور پھر ان کی خیال آفرینی اور ان کی مصوری ان کے اشعار میں ڈھل کر شبنم سے دھلے ہوئے صبح نو کی طرح آنکھوں میں تراوت پیدا کرتے ہیں۔ قتیل کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں نریش کمار شادتحریر فرماتے ہیں:

(۱) نریش کمار شاد۔ پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری۔ ص ۴۷

"ان کی مقبولیت کا راز ان کے لب ولہجہ کی شیرینی اور
گہری رومانیت میں مضمر ہے،اس رومانیت کا اکتساب انہوں
نے احمد ندیم قاسمی کے اثرات سے کیا ہے۔لیکن اپنے انفرادی
تجربوں اور ذاتی کاوشوں کی رنگ آمیزی نے ان اثرات کو نیا
حسن اور نئی زندگی عطا کی ہے۔"(۱)

قتیل ایک کامیاب گیت کار ہیں۔ان کے گیتوں میں تازگی،مٹھاس اور البیلا پن ہے۔
ان میں جہاں ایک طرف رقص وموسیقی کا ایک حسین منظر دیکھنے میں آتا ہے وہاں دوسری
طرف ان گیتوں میں کیف وسرمستی بھی ملتی ہے۔قتیل نے انوکھے اسٹائل سے اپنے گیتوں
میں نغمگی اور حسن پیدا کر دیا ہے۔اس نغمگی سے قاری میں خود بہ خود احساس کی گرمی پیدا
ہو جاتی ہے گیت نگاری میں قتیل کی آواز کوئی نئی آواز نہیں۔بے شمار شعراء نے اچھے اچھے
گیت تخلیق کیے ہیں لیکن قتیل نے عام روش سے ہٹ کر چند نئے تجربے کیے ہیں جن میں
ایک نیا اور انوکھا تجربہ تال اور سرگم کا ہے۔کیونکہ وہ پنجابی ماحول میں پلے بڑھے اور جوان
ہوئے۔اس کیفیت کو ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی یوں بیان کرتے ہیں:

"قتیل کے یہاں پنجاب کا صحت مند رومان ہے اور ان
کی وہی نظمیں ان کی انفرادیت متعین کرتی ہیں جن کا تعلق
عشقیہ جذبات سے ہے یا عورت کی زندگی کے کسی روپ کو پیش
کیا گیا ہے۔ان کی شاعری ہلکی پھلکی غنائی شاعری ہے اور ان
کے مزاج کو گیتوں سے بہت مناسبت معلوم ہوتی ہے۔"(۲)

قتیل کے مندرجہ ذیل گیتوں میں بے قراری تڑپ،غم دوراں اور غم جاناں اور ہجر
ووصال کی کیفیت اپنے پورے شدومد کے ساتھ ابھرتی ہیں۔مثلاً

---

(۱) نریش کمار شاد،پانچ مقبول شاعر اور ان کی شاعری،۷۰

(۲) ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی،اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ص ۱۹۸

بیتے برس میں جتنی چاندنی راتیں ہیں
بکھری ہوئی ان سب میں اپنی باتیں ہیں
تجھ سے مل کر پریت مری لہرائی تھی
بے سدھ ہوکر میں کنگنا کھنکاتی تھی
چپ چپ سے رہتے ہیں اب کنگنا میرے

شام سویرے۔اوسجنا

ذرا تم جھانک کر دیکھو کہ باہر کی فضا کیا ہے
جہاں بھی کوئی منظر ہے وہاں اک حشر برپا ہے
ذرا سی دیر میں جب یہ گھڑی بھی لوٹ جائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

گوری پیچ بجا رناچے
من ہی من میں تڑپے پھر بھی کر کے سنگار ناچے
گوری پیچ بجا رناچے

قتیل سُر، بحر، تال موسیقی اور سنگیت کے متوالے تھے۔اسی لئے ان کے گیتوں میں موسیقیت اور نغمگی کا ایک متوالا انداز ملتا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا، اُن کے گیتوں میں اس کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"قتیل شفائی کے گیتوں کا امتیازی وصف ان کی نغمگی اور جھنکار ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ رقص اور گیت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور گیت کی لَے میں رقص کرتے ہوئے قدموں کی جھنکار بھی شامل ہوئی ہے۔لیکن جس طرح رقص کی جھنکار نے قتیل شفائی کے گیتوں کا احاطہ کیا ہے۔اس کی مثال

عام طور پر سے ناپید ہے۔"(۱)

قتیل کے گیتوں میں منظر کشی کا بسیط اور پھیلا ہوا رجحان ملتا ہے اور یہی ایک کامیاب گیت کار کی ضمانت ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں خوبصورت اور زیادہ سے زیادہ دلکش مناظر پیش کرنے کے روادار ہیں۔ اس طریقہ کار کو اپنانے سے انہوں نے اپنے گیتوں میں ایک خاص قسم کا امتزاج پیدا کیا ہے۔ قتیل نے فضا سازی کا یہ رجحان اپنا کر اپنے گیتوں کا رنگ اور بھی دوبالا کیا ہے۔ وہ اپنے جذبات کو بڑے انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں ان تین چیزوں کا خاص طور پر احساس ہوتا ہے۔

۱۔ تمہید۔ ۲۔ مرکزی خیال۔ ۳۔ اختتامیہ

یہ تینوں چیزیں اُن کی گیت نگاری کی خصوصی پہچان ہے۔

قتیل شفائی کے گیتوں میں کبھی پگھلتی ہوئی چاندی، فضاؤں میں نمودار ہوتی ہے اور کبھی ہواؤں میں تیرتی ہوئی بے چینیاں محسوس ہوتی ہیں۔ کبھی پربت کے دامن سے آہستہ آہستہ چاند ظاہر ہونے لگتا ہے اور کبھی سورج کی سنہری کرنیں سارے عالم کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہیں۔ کبھی بھیگی راتوں میں تن بدن کی آگ خود بخود نمودار ہوتی ہے اور کبھی پہاڑوں اور جھرنوں کے پر بہار مناظر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ کیفیت قتیل کے گیتوں میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ مثلاً ان کا یہ گیت ملاحظہ کیجئے۔

ے قدرت نے کیا رنگ دکھایا
دکھیا کے گھر دکھیا آیا
ایک دوجے سے مانگ رہے ہیں خوشیوں کی خیرات
دیا جلے ساری رات
بکھر جائے گی جب پگھلی ہوئی چاندی فضاؤں میں
تو کچھ بے چینیاں سی تیر جائیں گی ہواؤں میں

(۱) ڈاکٹر وزیر آغاز: اُردو شاعری کا مزاج، ص ۲۳۱،۲۳۰

یہ کیف ہر اک سوئی تمنا کو جگائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

یا

جیسے شبنم پہ تھرکتی ہوئی سورج کی کرن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
کوئی تصویر خیالوں میں نظر آتی ہے
پاس کوئی نہیں آواز مگر آتی ہے
چاپ قدموں کی بنی جاتی ہے دِل کی دھڑکن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
میرے مچلے ہوئے خابوں کا مہکتا ہے چمن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

قتیل کے گیتوں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے گیت پیکروں میں ڈھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان پیکروں کے استعمال سے ان کے گیتوں میں محاکاتی عمل پیدا ہو گیا ہے مثلاً انہوں نے چاندنی راتیں، بے سدھ، ہرجائی پن، رسیلی چاندی، پربت کا دامن، برہن کے ساتھ، تاج اگن کا، آنسوؤں کی سوغات، آس کی جگنو، بھیگی پلکیں، آشا کی کلیاں وغیرہ جیسے الفاظ اور پیکر استعمال کر کے ان گیتوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اس طرح سے اُن کے گیتوں کا تاثر کافی دیر تک دل و دماغ میں گونجتا رہتا ہے۔ قتیل شفائی نے نئے نئے الفاظ کو شعری قالب میں ڈھال کر اپنے گیتوں میں ایک نئی دنیا بسائی ہے۔ ان کا تخیل ان کے گیتوں میں ڈھل کر مجرد تصور کی شبیہ سازی کے اعلیٰ نمونے پیش کرتا ہے۔ ان کے گیتوں میں جذبات نگاری بھی ملتی ہے اور کیف و سرمستی بھی۔ قتیل کے ہاں نرم اور ملایم ہندی آمیز الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی کے الفاظ اور تراکیب بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ حامدی کاشمیری، قتیل کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"قتیل شفائی کے اسلوب میں بہر کیف، انفرادیت کے
نشان ملتے ہیں، وہ لفظوں اور ترکیبوں کی چھپی ہوئی معنویت کا
شعور رکھتے ہیں۔"(۱)

اس بیان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ قتیل کے کلام میں جہاں گہرائی ہے وہاں ان کے ہاں گیرائی بھی ملتی ہے۔ ان کے گیتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں انفرادیت کے نشانات واضح طور پر نظر آتے ہیں مثلاً۔

وہ دیکھو چاند بھی پربت کے دامن سے نکل آیا
بہت پچھتاو گے ایسے میں گرما تھے پہ بل آیا
الگ رہنے سے دونوں کو یہ تنہائی ستائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

بھولنے والے یاد تجھے میں کرتی ہوں
پر تیرے ہرجائی پن سے ڈرتی ہوں
الٹا تو الزام نہ مجھ پر دھرتا ہو
یاروں میں مجھ کو بدنام نہ کرتا ہو
میں نے تو سکھیوں میں گائے گن تیرے

شام سویرے۔ اوسجنا

میرے مچلے ہوئے خوابوں کا لہکتا ہے چمن
آج پھر جھوم رہاہے میرامن
کھو گئی پیار کی ٹھنڈک میں جدائی کی جلن
آج پھر جھوم رہاہے میرا من

۱) ڈاکٹر حامدی کاشمیری: جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات، ص ۳۴۵

میرے شانوں پہ ہے بکھری ہوئی زلفوں کی گھٹا
جانے کیا کہتی ہے مجھ سے تیرے آنچل کی ہوا
اپنے ہی سائے سے شرمانے لگا میرا بدن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

قتیل شفائی کے گیتوں کی انفرادیت اسی میں ہے کہ انکے ہاں ارضی تشبیہات اوراستعارات کا کثیر تعداد میں استعمال ہوتا ہے۔اس طرح سے ان کے گیتوں میں تڑپ اور گداختگی پیدا ہوگئی ہے۔شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، منیر نیازی، زبیر رضوی، قمر جلال آبادی ،بیکل اُتساہی ،تنویر نقوی ، تاج سعید ، جمیل الدین عالی، ندا فاضلی اور ناصر شہزاد وغیرہ جیسے گیت کاروں نے جہاں ایک طرف پرانی تشبیہات اوراستعارات کو نئے معنوں میں استعمال کر کے گیت نگاری کا فن بام عروج پر پہنچا دیا ہے۔ وہاں قتیل نے بھی اپنی انوکھی تشبیہات اوراستعارات سے اس فن کو مستحکم بنانے میں اپنا خاص حصہ ادا کیا۔ جہاں تک قتیل کے گیتوں میں اس عمل کا دخل ہے۔ان کے ابتدائی گیتوں میں روایتی تشبیہات اور استعارات ملتے ہیں لیکن ان کے نئے گیت بڑے معنی خیز ہیں۔ان میں نیا اور انوکھا پن ملتا ہے۔قتیل روایت سے بغاوت بھی نہیں کرتے ہیں اور عصری حسیت سے منہ بھی نہیں موڑتے ہیں۔اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ان کی شاعری روایتی اور عصری خیالات کا سنگم ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔یہ اثرات اُن کی گیت نگاری میں بھی نظر آتے ہیں۔

قتیل کے گیتوں میں رنگا رنگ تشبیہات ،انوکھے استعارات اور نرم اور سبک الفاظ ملتے ہیں۔اس کے علاوہ ان میں تغزل اور موسیقیت کا عنصر ہر جگہ غالب ہے۔مثال کے طور پر اُن کے چند گیت پیش خدمت ہیں:۔

سوامی سمجھے گھونگھٹ پیچھے ہوگا چاند کا ٹکڑا
گھونگھٹ کے پٹ کھلے تو نکلا مرجھایا سا مکھڑا
ڈھانپ کے روئے سر جھائے سے مکھڑے کو البیلی دلہن

کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے

اب تان اگر کوئی گونجے گی میں موت کا راگ سناؤں گی
بنسی نہ اگر خاموش ہوئی میں تڑپ تڑپ مرجاؤں گی

بیتے دن یاد دلاتا ہے
کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے

تیرا میرا دِل دھڑکن کا ناتا تھا
میں نہ ملوں تو چین تجھے کب آتا تھا
یاد تو ہوں گے پیار بھرے وہ دن تجھ کو
دنیا سونی لگتی تھی مجھ بن تجھ کو
کرتا رہا تو میری گلیوں کے پھیرے

شام سویرے۔ اوسجنا

قتیل شفائی کی گیت نگاری کا بنیادی وصف ان کی زبان کی تازگی اور مٹھاس ہے۔ اس طرح کی زبان کے استعمال سے ان کے گیتوں میں ایک نئی کیفیت اُجاگر ہوتی ہے۔ قتیل اردو زبان کے ساتھ ساتھ ہندی کے میٹھے اور رَس دار الفاظ کو بھی خاطر میں لاتے ہیں۔ اُن کے گیتوں میں اس طرح کی زبان کے استعمال سے ایک نئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ زبان و بیان کے استعمال کا یہ طریقۂ کار قتیل شفائی کا ایک اہم وصف ہے۔ اور یہ کیفیت ان کو اپنے ہم عصر گیت کاروں میں منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ مثلاً ان کے گیتوں میں افلاکِ قاعدہ، صلہ، انگشت بدنداں، ایاغ، ضوفگن، مغموم، طاق، خس وخاشاک، نم آلودہ، عجز، عروس زندگی آمدیدہ، انبوہ غفیر جیسے الفاظ کے ساتھ ساتھ دیا، نیر، برہن، اگن، اندھیارے، دکھیا، دوجے، بابل، سندو، دیپک، موہے، آشا، پات، چھمک، جھن جھن، گوری، بوند، پل، سجنا، برس، پریت، کنگنا، سکھیوں وغیرہ جیسے ہندی کے نرم اور سبک الفاظ کا استعمال ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔ قتیل کے گیتوں میں الفاظ کا یہ خوبصورت استعمال قابل

غور سے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

نسیم سحر نے مجھے گدگدایا۔ ہنسا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آ گئے ہیں
چہکتے ہوئے پنچھیوں نے جگایا۔ جگا کر یہ مجھ کو بتایا کہ وہ آ گئے ہیں
مہکنے لگا پھر گلابی سویرا
ملا مجھ سے بچھڑا ہوا پیار میرا
محبت بھرا گیت بھنوروں نے گایا۔ لبھایا۔ لبھا کر یہ مجھ کو بتایا کہ وہ آ گئے ہیں

⊙

میں جو انگڑائیاں لوں دل میں مرے ہوک اُٹھے
میری ہر سانس میں کوئل سی مدھر کوک اٹھے
کیا اسی چیز کو کہتے ہیں محبت کی لگن
آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

⊙

کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے
برگد کے گھنیرے سائے میں جب گونجے گی آواز کوئی
میں جان پہ کھیل تو جاؤں گی پر کھل جائے گا راز کوئی
بدنامی سے دل گھبراتا ہے
کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے

قتیل شفائی کے گیتوں کا بنیادی موضوع عورت کی نفسیات ہے۔ وہ عورت کو ہر زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے روادار ہیں۔ ان کے خیال میں عورت دنیا میں سب سے انوکھی شئے ہے اور اس شئے کو سنوارنا اور سجانا مرد کا کام ہے۔ ان کے مطابق مرد میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ عورت کو صرف جنسی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ عورت صرف جنس اور طوائف کا ایک پیکر ہی نہیں بلکہ محبت، پیار اور خلوص کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا زاپنی کتاب

میں قتیل کے گیتوں میں اس جذبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قتیل کے گیت میں عورت اس پنچھی کی طرح اُبھری ہے۔ جسے تازہ تازہ پر عطا ہوئے ہوں اور جو ابھی اڑنے کے قابل تو نہ ہوئی ہو۔ تاہم جس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ نے نغمے میں ایک انوکھی جھنکار کا اضافہ ضرور کر دیا ہو۔" (۱)

قتیل عورت کی سماج میں ہر طرح ترجمانی اور وکالت کرتے ہیں۔ عورت کے سسرال کا ظلم وستم ہو یا میکے کی طرف مراجعیت، اس کے خاوند سے بدگمانیاں ہوں یا سرِ بازار عورت کے نیلام ہونے کا منظر۔ روٹھی اور گھر کے کونے میں سہمی ہوئی عورت کی تصویر کشی ہو یا میرا کی طرح سنسار تیاگ کر کے پچارن، قتیل جیسے شاعر کا قلم برابر چلتا رہتا ہے۔ ان تمام جذبات کو قتیل نے اپنے گیتوں میں جگہ دی ہے اور اس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ان گیتوں میں ذاتی مشاہدات اور تجربات کا ردعمل پیش کیا ہے۔

قتیل شفائی کے گیت عشقیہ جذبات سے سرشار ہیں۔ ان میں عشق ومحبت کی بے شمار جھلکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کے گیتوں میں نہ صرف عاشق اور محبوب کے شوخ جذبات ہی دیکھنے میں آتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ طنزیہ لب ولہجہ بھی ملتا ہے۔ وہ آج کل کے سماج، حکومت اور موجودہ دور کے انسان کو طنز کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ قتیل شفائی کو اپنے وطن پنجاب سے والہانہ عقیدت ہے۔ اسی لئے ان کے گیتوں میں پنجاب کی لہلہاتی فضائیں اور اس کے ماحول کا البیلا پن دیکھنے میں آتا ہے۔ قتیل اگرچہ اپنے دور کے منفرد شاعر تھے لیکن اُن کے نغمے سدا بہار ہیں۔ ان میں ایک عجیب البیلا پن ایک عجیب مستانہ روی اور نیا پن ہے، جو دِلوں میں بے نام درد کی ٹیس جگاتا ہے۔ قتیل کی شاعری اپنے اچھوتے اور کنوارے اسلوب اور موضوع کے برتاؤ کی وجہ سے کافی دنوں تک زندہ رہے گی۔

(فن اور شخصیت، بمبئی، قتیل شفائی نمبر، شمارہ نمبر ۱۳۔۱۴، ستمبر ۸۱ء، مارچ ۸۲ء)

---

(۱) ڈاکٹر وزیر آغاز۔ اردو شاعری کا مزاج، ص ۲۳۱، ۲۳۰

بلبل کاشمیری۔ شخص وشاعر

ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے بیسیوں خاندان ایسے ہیں جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں آباد ہوئے۔ ان خاندانوں میں بعض ایسے مشاہیر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیت سے اردو شعر وادب میں نمایاں مقام پیدا کیا۔ ان مشاہیر میں قدرت اللہ شہاب، چراغ حسن حسرت، اللہ رکھا ساغر، رفیق خاور، میر عبدالعزیز، خواجہ عبدالصمد وانی، طاؤس بانہالی، لطیف کاشمیری، حبیب کیفوی، احمد شمیم، کیف اسرائیلی، قیس شیرانی، عزیز کاش، امین حزین، اثر صہبائی، محمود ہاشمی، رشید امجد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بلبل کاشمیری ایسے ہی فنکاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

بلبل کاشمیری وادئ کشمیر کے ایک معروف انشا پرداز، ایک باصلاحیت ادیب اور قابل ذکر شاعر ہیں۔ وہ طنز ومزاح کے میدان میں گہرا شغف رکھتے ہیں اور نظم کے وسیلے سے رنگارنگ پھول کھلا رہے ہیں۔ یہ بات باعث طمانیت اس لئے بھی ہے کہ وہ اردو کی بستی سے دور لندن میں رہائش پذیر ہیں اور شعر کے میڈیم سے ادب کی بے لوث خدمت کرتے ہیں۔

بلبل کاشمیری کا خاندانی نام شیخ غلام علی ہے۔ وہ ۱۶/ اپریل ۱۹۲۲ء کو کشمیر کے ایک دور دراز گاؤں آجر (بانڈی پورہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مڈل اسکول بانڈی پورہ میں حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سوپور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم حاصل

کرنے کیلئے انہوں نے سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۷ء میں بی اے کا امتحان امتیاز سے کامیاب کیا۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد بلبل محکمہ تعلیم میں مدرس ہوگئے اور وادی کے اطراف واکناف میں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک وہ بلتستان کے کرگل اور اسکردو کے اسکولوں میں پڑھاتے رہے(۱) بلبل تعلیم کے پیشے سے متنفر تھے۔ اپنے عزیز دوست اور کشمیری زبان کے معروف شاعر غلام محمد عارض (مرحوم) کے نام اپنے دل کے جذبات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرا مستقبل ٹیچری پر ختم ہے۔ میں کہاں ہوتا اور کیا ہوتا۔ مگر اُف بدقسمتیوں نے گھیر کر رکھ دیا ہے۔ تیرہ بختی بجلی کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ اب چاہتا ہوں کہ حسین موت ہی اب میرے عیوبِ برہنگی، کو چھپا دے۔ میرے دل کے تمام ارمان اب سو گئے ہیں۔ تمنائیں ماند پڑ گئیں۔(۲)

بلبلؔ ۱۹۴۲ء میں انڈین آرمی میں بھرتی ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو وہ پاکستان آرمی میں ملازم ہوئے۔ جہاں مختلف محاذوں پر لڑتے رہے۔ سالہا سال تک بلبل توپوں اور بندوقوں سے کھیلتے رہے لیکن انہوں نے کبھی بھی قلم کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انہوں نے فیض اور ضمیر جعفریؔ کی طرح مشق سخن جاری رکھی اور اپنے لئے مخصوص مقام بنایا۔ فوج میں برسوں تک اپنے فرائض انجام دینے کے بعد وہ کچھ عرصہ پہلے ریٹائر ہوگئے۔ اور اب لندن میں مستقل طور پر مقیم ہیں۔(۳)

بلبل کاشمیری شروع سے ہی پڑھنے لکھنے سے شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے ابتداء

---

(۱) بلبل کاشمیری کا ایک خط راقم السطور کے نام

(۲) کشمیری زبان کے معروف شاعر غلام محمد عارض (مرحوم) کے نام بلبل کاشمیری کے اس خط کے لئے میں آنجہانی موتی لال ساقی کا شکرگزار ہوں۔

(۳) بلبل کاشمیری چند برس قبل لندن میں انتقال کر گئے۔

سے ہی شعر کہنا شروع کیے۔اس زمانے میں سری پرتاپ کالج سرینگر ریاست میں ادبی مجالس کا مرکز تھا۔کشمیر کے اکثر شاعر اور ادیب کالج کی انہی مجالس سے فیض حاصل کر چکے ہیں۔ ریاست کے بعض معروف قلمکاروں نے اسی کالج میگزین پرتاپ، سے اپنا ادبی سفر شروع کیا اور بقول پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) ''رسالے میں لکھنے والے طلباء میں سے کئی اس زمانے کے اچھے انشاپردازوں اور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔(۱)

بلبل شروع سے ہی ذہین تھے۔کالج کے زمانے میں ہی وہ اپنی شاعری اور انشاء پردازی کا لوہا منوا چکے تھے۔اپنی اسی بے پناہ صلاحیت کی وجہ سے وہ کالج میگزین، پرتاپ، کے حصہ اردو کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ان کے ہم عصر اور لنگوٹیے یار جناب غلام محمد میر طاؤس اپنے شعری مجموعے، موج موج، کے پیش لفظ میں بلبل کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''جن دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا۔بلبل (شیخ غلام علی بلبل) نام کا اس وقت کا ایک اعلیٰ پائے کا ادیب اور شاعر بھی اسی کالج میں زیر تعلیم تھا۔بلبل مجھ سے دو سال آگے تھا۔شگفتہ انشاپردازی اور شوخ مزاح نگار کے لئے کالج سے باہر کے علمی اور ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔''(۲)

غلام محمد طاؤس سے بلبل کے بڑے گہرے مراسم تھے۔وہ بھی اچھے انشاپرداز اور شاعر تھے۔نظم ونظر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔دونوں کشمیر کے معروف شاعر جناب میر غلام رسول نازکی کی صحبت سے اکثر فیضیاب ہوا کرتے تھے، جو ان کو مشورہ بھی دیا کرتے تھے اور شعر کے رموز سے آشنا بھی کرتے تھے۔نازکی صاحب نے اپنے ان دونوں شاگردوں کو اقبال کے ایک شعر سے ایک دن استقبال کیا۔یہی شعر بعد میں ان دونوں

(۱) پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ) ص ۳۴۲

(۲) موج موج (شعری مجموعہ) از غلام محمد میر طاؤس۔ص۔۱۲

شعراء کے تخلص کا باعث بن گیا۔ شعر ملاحظہ ہو:

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبلؔ فقط آواز ہے ، طاؤس فقط رنگ

بلبل اپنے شعری مجموعے کے پیش لفظ میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جناب غلام محمد (جو آگے چل کر کمشنر اور ہوم سیکریٹری ہوئے) شاعری میں ہمارے سب سے بڑے حریف اور زندگی میں عزیز ترین دوست تھے۔ ہم دونوں نے کالج میگزین کو اپنی مشق سخن کے لئے تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ ادبی حلقوں میں میر غلام رسول نازکی کا بڑا شہرہ تھا۔ ہم دونوں اکثر ان کی صحبت سے فیضیاب ہوا کرتے۔ ایک روز ہم پہنچے تو نازکیؔ صاحب نے علامہ اقبالؔ کے اس شعر سے ہمارا استقبال کیا:

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

"اس روز سے ہم بلبل ہوگئے اور غلام محمد صاحب طاؤس۔" (۱)

بلبلؔ کاشمیری نے شاعری کا آغاز رواں صدی کے تیسرے عشرے (۲) کے آخر سے کیا۔ اُس زمانے میں ریاست کے شعری افق پر شعرا کا ایک قافلہ رواں دواں تھا۔ جن میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر، برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی، علامہ عاملؔ درویش، مرزا کمال الدین شیدا، طالب کاشمیری، شہہ روز کاشمیری، تنہا انصاری، مست کاشمیری، فطرت کاشمیری، رسا جاودانی، کشن سمیلپوری، عشرت کاشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں لیکن ان تمام شعراء میں سے

(۱۔۲) خندۂ گل (شعری مجموعہ) از بلبل کاشمیری۔ ۹۔۱۰

میر غلام رسول نازکی کی آواز دور سے پہچانی جاتی تھی۔ ایسے میں ایک نو وارد شاعر بلبل کاشمیری سامنے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ادبی محفلوں میں اپنی ساخت قائم کرنے لگے۔ ابتدائی کلام میر غلام رسول نازکی کو دکھایا لیکن جلد ہی اپنے کلام کے بال و پر خود ہی سنوارنے لگے۔ خندۂ گل، کے دیباچے میں خود رقمطراز ہیں:

''میر غلام رسول نازکی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وہ ہماری اوّلین درس گاہ میں ہمارے استاد تھے۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ تو عام تھا مگر ہم پر ان کی نگاہِ شفقت خاص تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بلبل کی شاعری نے انہی کی حوصلہ افزائی سے بال و پر نکالے تھے۔ (۱)

بلبل کے ذیل کے اشعار ان کے کالج کے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ اشعار انہوں نے بطور خاص لندن سے مجھے مرحمت فرمائے۔

امتحانوں میں تیاری کی ہمیں عادت نہیں
امتحان کے ہال میں الہام ہونا چاہیئے
تجھے کیوں دخترِ زر سے عداوت ہوگئی زاہد
مجھے وہ اس زمانے کی دلی معلوم ہوتی ہے

کالج سے فارغ ہونے کے موقعہ پر بلبل نے ایک طویل نظم کہی تھی جس کا مطلع ہے:

اے معزز اوستادو لیکچرارو الوداع　　آسمانِ علم کے روشن ستارو الوداع

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ بلبل کو میر غلام رسول نازکی کے ساتھ گہرے مراسم رہے ہیں۔ وہ ان کے دوست بھی تھے اور رہنما بھی (۲) نازکی صاحب نے بلبل کے نام ایک منظوم

(۱) خندۂ گل (شعری مجموعہ) از بلبل کاشمیری۔ ص ۱۲

(۲) دونوں حضرات کئی برس ہوئے اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

خط بھی لکھا ہے۔ جو قابل مطالعہ ہے۔ اس میں وہ بلبل سے شکوہ کرتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

مجھ سے کیا تقصیر سرزد ہوگئی　　بندہ پرور ظلم کی حد ہوگئی
ڈاکیے کا راستہ کب تک تکوں　　تو ہی کہہ میں صبر کتنا کر سکوں

نازکی چشم نثار بلبل است
حیف بلبل کشتہ نازِگل است (۱)

بلبلؔ کا ابتدائی کلام دستیاب نہیں، وہ ایک شعری مجموعہ لب شیریں، کے نام سے ترتیب دے چکے تھے، جو بد قسمتی سے کسی شخص نے چرالیا۔ یہ مجموعہ ۱۴۰ صفحات پر مشتمل تھا لیکن اس کی اشاعت میں انہوں نے تامل سے کام لیا۔ خندہ گل کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ ''اسی تامل اور تذبذب میں ہم اپنے کلام کا ایک حصہ کھو بیٹھے'' اپنی نظم بیاض چوری ہو جانے پر، میں اس کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ نظم کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

شاعر رنگین نوا کا گھر لٹا پھر وقت شام
چودھویں تاریخ ملتی تھی روزوں کے دن ماہِ صیام

---

(۱) پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) اپنی کتاب کشمیر میں اُردو (تیسرا حصہ) سنہ اشاعت ۱۹۸۴ء، ص ۴۴، میں لکھتے ہیں کہ بلبل نے ایک منظوم خط میر غلام رسول نازکی کے نام لکھا تھا۔ جن سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے ابتدائی دو شعر اور آخری شعر درج ذیل ہے۔

مجھ سے کیا تقصیر سرزد ہوگئی　　بندہ پرور ظلم کی حد ہوگئی
ڈاکیے کا راستہ کب تک تکوں　　تو ہی کہہ میں صبر کتنا کر سکوں
نازکی چشم نثار بلبل است　　حیف بلبل کشتہ نازگل است

سروری صاحب کا یہ بیان درست نہیں ہے۔ دراصل یہ منظوم خط نازکی صاحب نے بلبل کے نام لکھا۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں بلبل اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''مندرجہ ذیل اشعار میر غلام رسول نازکی نے میرے نام لکھے تھے (یہ میرے اشعار نہیں ہیں)
''مجھ سے کیا تقصیر سرزد ہوگئی۔ بندہ پرور ظلم کی حد ہوگئی۔ نازکی دیدم نثار بلبل است حیف بلبل کشتہ نازگل است''
(راقم السطور کے نام بلبل کے ۲۱ر مارچ ۱۹۹۶ء کے ایک مکتوب سے اقتباس)

لٹ گئی سب دولت شعر وسخن ساماں کے ساتھ
وہ بیاض شعر تھی جس کا لبِ شیریں تھا نام
مشتمل تھی ایک سو چالیس صفحوں پر بیاض
غیر مطبوعہ ابھی تک تھا وہ دوشیزہ کلام

بلبلؔ کاشمیری کا ایک شعری مجموعہ ''خندۂ گل'' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں ادارہ ٔفروغ اُردو لاہور نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کشمیر کے مناظر سے متعلق ان کی سنجیدہ نظموں کا مجموعہ 'دستِ چنار' بھی چھپ چکا ہے۔ ان کا ایک اور مجموعہ شیر وشکر (۱) عنقریب ہی زیور طبع سے آراستہ ہو رہا ہے، جو ان کے مزاحیہ کلام پر مشتمل ہے۔ بلبل اپنی مزاح نگاری سے اس افسردہ دنیا میں ہنسی تقسیم کررہے ہیں اور یہی ان کا نظریہ شعر ہے۔ (۲)
'خندہ گل' بلبل کی مزاحیہ وطنزیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس کا پیش لفظ ''بلبل شیرین مقال کے عنوان سے معروف شاعر وطنز نگار سید ضمیر جعفری نے لکھا ہے۔ انہوں نے اپنے پرمغز پیش لفظ میں بلبل کی شخصیت اور شاعری پر بھرپور روشنی ڈالی ہے لیکن وہ خندۂ گل کو بلبل کی مزاحیہ نظموں کا پہلا مجموعہ قرار دیتے ہیں (۳) جبکہ اس مجموعے میں مزاحیہ نظموں کے علاوہ موضوعاتی مزاحیہ غزلیں، قطعات، مخمس اور متفرق اشعار سب کچھ شامل ہے۔ بلبل مجموعے کا آغاز ایک دعائیہ نظم سے کرتے ہیں۔ اسکے بعد نظموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ بلبل کی مزاحیہ نظمیں ہیں جن کو انہوں نے گوشہ فرنگ ورنگا رنگ کے عنوان سے مجموعے میں شامل کیا ہے۔ ان نظموں کو دوحصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ گوشہ فرنگ۔ ۲۔ رنگارنگ

یہ دو عنوانات مغرب ومشرق کی علامتیں ہیں۔

---

(۱) بلبل کاشمیری کا ایک خط راقم السطور کے نام۔
(۲) بلبل کاشمیری کا ایک خط راقم السطور کے نام۔
(۳) خندہ گل از بلبل کاشمیری ص ۲۱

گوشۂ فرنگ میں بلبل نے لندن کی فضاؤں سے متاثر ہوکر نظمیں شامل کی ہیں۔لندن کے لوگوں کا رہن سہن، وہاں کا کلچر، تہذیب وتمدن، مشہور بازاروں اور دلکش مقامات کا ذکر، لندن میں مستقل طور پر قیام کرنے والے غیر ملکی خاص طور پر مشرق سے آئے ہوئے لوگوں کی طرز زندگی اوران کے مشاغل وغیرہ ان نظموں کے موضوعات ہیں ان میں طنز ومزاح کا بھرپور پہلوا پنے پورے آب وتاب کے ساتھ اُجاگر ہوتا ہے۔ان نظموں میں ''انگلستان میں لندن کی رات، لندن کا موتی بازار، ڈالر مرہا ہے، شاعر کی وصیت، کالا لوگ وغیرہ ذکر کے قابل ہیں۔نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

آنکھ نیلی ، بال نقلی چست جامہ مست چال
دلبروں کی ہے یہی پہچان انگلستان میں

آیئے بریڈ فورڈ چلتے ہیں سیاحت کے لئے
دیکھ لیں گے آپ پاکستان انگلستان میں

ہے اردو کا تصدق ہوگئے شیر وشکر
آکے پاکستان وہندوستان انگلستان میں

(انگلستان میں)

گلبانگ ناؤ نوش ہے گھر گھر تمام رات
برپا ہے جشن بادہ وساغر تمام رات

لندن کی رات عشق وجوانی کی رات ہے
بہتا ہے عشرتوں کا سمندر تمام رات

ایک بینک کے سٹاف میں بیوی تمام دِن
اک فیکٹری کے بیچ میں شوہر تمام رات
(لندن کی رات)

سردیوں کی سرد مہری سے ٹھٹھر جاتی ہے دھوپ
لوگ حیراں ہیں کہ جاڑے میں کدھر جاتی ہے دھوپ
مسکرا لیتے ہیں وہ گیسو بکھیرے دن کو جب
رات کے تاریک سایوں پر بکھر جاتی ہے دھوپ
شرم سے مُنہ ڈھانپ لیتی ہے یہ گوری پردہ وار
کون کہتا ہے کہ ان گوروں سے ڈر جاتی ہے دھوپ
(ولایتی دھوپ)

لندن کے گردونواح میں 'سوتھال' نام کی ایک بستی ہے۔ یہ بستی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کالے لوگوں کی اکثریت ہے۔ گورے لوگ جن کا یہ اصلی مسکن ہے۔ آہستہ آہستہ سے غائب ہوتے جارہے ہیں۔ بلبل کی یہ نظم ایک طنزیہ نظم ہے جس میں کالے اور گورے کے درمیان تضاد اور ٹکراؤ کی کیفیت ملتی ہے لیکن اس بستی میں اپنی اکثریت کی وجہ سے کالے لوگ ہی حاوی ہیں۔ یہ بند ملاحظہ ہو:

سابقہ گورے کبھی سوتھال میں آتے نہیں
دال میں کالا ہے کہہ کر دال وہ کھاتے نہیں
دیس کو پردیس کہنے میں وہ شرماتے نہیں
شہریت ان کی خود ان کے شہر میں پامال ہے
ہر طرف سوتھال میں سوتھال ہی سوتھال ہے
(سوتھال)

نظموں کے دوسرے حصے "رنگارنگ" میں بندر روڈ پر بس میں، میرا روزہ، دفتر کھلا

بیاض چوری ہوجانے پر، اودیس سے آنے والے بتا وغیرہ جیسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں مشرقی تہذیب وتمدن کی بھرپور جھلکیاں پیش کرتی ہیں۔ ان نظموں میں مشرق میں تیزی سے پھیلی ہوئی نئی تہذیب کا ذکر، دفتروں کا حال، کراچی کے نواح میں فوجی چھاؤنی کی مصروفیات اور اپنے مادروطن کشمیر کے تئیں ان کے والہانہ جذبات اور اس طرح کے رنگا رنگ موضوعات پر نظمیں شامل ہیں۔ بلبل کی نظم 'بس میں' اپنی نوعیت کی انوکھی کوشش ہے۔ اس نظم میں مزاحیہ انداز میں بلبل نے بسوں میں سواریوں کے اُورلوڈ سے برے حال پر بھرپور طنز کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

اک اک سیٹ پہ دس دس بس میں   اک دنیا ہے بے بس، بس میں
گھر کا سامان سر پر رکھ کر   تیلی دھوبی ہر کس، بس میں
دلی، ڈھاکہ، جہلم، گلگت   بستی بستی کا رس، بس میں
تھری ٹن لاری سوٹن بھاری   توبہ توبہ بس بس بس میں
بابو پتلے ترچھے ترچھے   تاجر چورس چورس بس میں
میرے گھٹنے سب کا بستر   کیوں نہ نکلے بھرکس بس میں
بیگم غمگین اگلی صف میں   ہوگیا میلا اطلس بس میں
بس ہے یا اک چڑیا گھر ہے   مرُغے چوزے سارس بس میں
رونا ان کا دریا دریا   بچوں کا ہے کورس بس میں

بلبلؔ اپنے مادروطن کشمیر سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ گذشتہ کئی دہائیوں سے غیرممالک کی خاک چھان رہے ہیں لیکن اپنے مادروطن کو نہیں بھولے ہیں۔ ان کی شاعری میں کشمیر کی جھیلوں، ندی نالوں، آبشاروں اور کھیتوں اور کھلیانوں کی بوباس محسوس کی جاسکتی ہے۔ اودیس سے آنے والے بتا، بلبل کی ایک نمائندہ پیروڑی ہے۔ یہ دراصل شاعر رومان حضرت اختر شیرانی (مرحوم) کی ایک مشہور نظم ہے جس کو بلبل نے اختر شیرانی کی روح سے دست بستہ معذرت کے ساتھ پیروڑی کے رنگ میں ڈھالا ہے۔ بلبلؔ پیروڑی لکھنے

میں کمال رکھتے ہیں۔ انہوں نے اقبالؔ، اختر شیرانی، ہری چند اختر اور اکبر الہ آبادی کے بعض مصرعوں پر پیروڑیاں لکھی ہیں۔ پیروڑی اور مزاح نگاری کے لئے بلبل کے ساتھ ساتھ کشمیر کے قاضی غلام محمد بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی نظم اسلام آباد کا سفر، خالص مطالعے کی چیز ہے۔ بلبل بھی طنز کے تیکھے تیر چلاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کا لہجہ مختلف ہے۔ قاضی غلام محمد نے بے شمار پیروڑیاں لکھی ہیں۔ وہ بھی بلبل کی طرح غالب، اقبال، اختر شیرانی اور ضمیر جعفری سے متاثر ہیں۔ قاضی اور بلبل کے ہاں بعض چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں ہم وطن اور ہم عصر ہیں۔ دونوں طنز و مزاح کے دلدادہ ہیں، دونوں بڑے انوکھے انداز میں پیروڑیاں لکھتے ہیں۔ دونوں خود بڑے سنجیدہ ہیں۔ لیکن دوسروں کا قہقہہ بلند کرنے کے ہتھیار بہم کرتے ہیں۔ قاضی نے بھی اختر شیرانی کی اسی نظم او دیس سے آنے والے بتا، پر پیروڑی لکھی ہے جس پر بلبل نے خوشہ چینی کی ہے۔ بلبل اس پیروڑی میں اپنے وطن کشمیر میں رہنے والے دوستوں اور مفلوک الحال عوام کا حال دریافت کرنے کے خواہاں ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ماگام، جھیل ڈل، گلمرگ وغیرہ جیسے تاریخی مقامات کو یاد کرتے ہیں جن کی عطر بیز ہواؤں سے وہ بچپن میں محظوظ ہوئے ہیں اور اب بھی ان ہواؤں کا رس اور مس ان کی رگ رگ میں گردش کر رہا ہے نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

او دیس سے آنے والے بتا

کس حال میں ہیں یاران وطن	ڈاران وطن کاران وطن
شیخان وطن ، لالان وطن	پیران وطن ، میران وطن
ماگام کے خوش فرغان وطن	ڈل جھیل کے سیل روان وطن
گلمرگ کے گلپوشان وطن	سنبل کے سیہ چشمان وطن

او دیس سے آنے والے بتا

اور اب قاضی غلام محمد کا مخصوص رنگ دیکھئے

کیا اب بھی وہاں ہر گنجا سر اسکالر سمجھا جاتا ہے

کیا اب بھی وہاں کا ہر ایم اے غالب پر کچھ فرماتا ہے
اور جہل کی ظلمت میں کھو کر اقبال سے بھی ٹکراتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا

''خندہ گل' کا دوسرا حصّہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ بلبل کی باعنوان یعنی مسلسل غزلیں ہیں۔ عنوانات بڑے دلچسپ ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعے سے بھی بلبل کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ یہ عنوانات کچھ اس طرح ہیں۔

ایسی تیسی غزل، فروٹی غزل، بینکا کی غزل، کڑوی غزل، ریٹ غزل، طبی غزل، فوجی غزل، موٹر غزل، جغرافیائی غزل، موچیانہ غزل، پاولی غزل، یہ عنوانات بلبل نے ردیف اور قافیے کی مناسبت سے رکھے ہیں۔ ان میں سے بعض غزلوں میں اول سے آخر تک گہرا ربط دکھائی دیتا ہے۔ موضوعاتی غزلوں کے لئے جدید اردو شاعر باقر مہدی بھی انفرادیت رکھتے ہیں۔ اپنی سیاہ اور سفید غزلوں کیلیئے وہ جدید غزل میں نمایاں مقام بنا چکے ہیں۔ ان کی یہ غزلیں اپنے اندر گہرا ادراک رکھتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بلبل کاشمیری غزل گوئی پر پوری گرفت نہیں رکھتے۔ ان کی غزلوں میں بھی ان کی نظموں کی طرح شوخی اور طنز و ظرافت کی جھلکیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ بلبل غزل کہنے کا اپنا مخصوص انداز رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے اظہار کے لئے نظم کو ہی ضروری سمجھتے ہیں لیکن غزل سے بھی انہیں فطری مناسبت ہے اور اس کو مقبول ترین صنف سخن تصور کرتے ہیں۔ انہیں کلیم الدین احمد کے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

''غزل۔ شاعری کی مقبول ترین صنف ہے کلیم الدین احمد نے اگر غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہا ہے تو یہ اس کی اپنی ذاتی رائے ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایڈیٹر نامہ نگار کی رائے سے متفق ہو یا نامہ نگار ایڈیٹر کی رائے سے متفق ہو۔''

بہر حال مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ بلبل ایک اچھے غزل گو شاعر بھی ہیں۔ ان کی باعنوان یا موضوعاتی غزلوں میں ان کی نظم کی طرح طنز و مزاح کا پہلو کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

جس یار کی خاطر عاشق نے گھر بار کی ایسی تیسی کی
اُس یار نے یاری توڑی ہے، اس یار کی ایسی تیسی کی

(ایسی تیسی غزل)

چاہا شراب چھوڑ دوں کھا کر کوئی دوا
دیکھا تو ہیں شراب سے بڑھ کر دوا کی ریٹ

(ریٹی غزل)

یہ چیچک کے داغوں کی رونق تو دیکھو
رُخ یار کیا گلستان ہو رہا ہے

(طبی غزل)

مقام جنگ ہو یا امن رہتا ہوں کمربستہ
سپاہی ہوں مرا بستر ہمشہ گول ہے ساقی

(فوجی غزل)

بنکاک کے پھولوں کی بلبل نے مہک سونگھی
گھومے گی مہک برسوں یہ خاک کی گلیوں میں

(بنکا کی غزل)

وہ شکر لب دفعتاً کڑوا کیلا ہوگیا
ہم جسے کیلا سمجھتے تھے کریلا ہوگیا

(کڑوی غزل)

بلبلؔ کی رگ رگ میں کشمیر کی عطر بیز فضائیں بسی ہوئی ہیں۔ اس موضوع پر ان کی

غزلوں میں بھی بے شمار اشعار ملتے ہیں جو روح کو تازہ کرتے ہیں۔ کبھی وہ لندن میں بیٹھ کر کشمیری چائے کا لطف اٹھاتے ہیں اور کبھی وہ خیالوں میں اپنے بچھڑے ہوئے گاؤں آجرا[1] پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی زعفران کے ہرے بھرے باغوں میں بے اختیار گھومنے لگتے ہیں اور کبھی کشمیر کی خوبصورت جھیل ولر[2] کی فضاؤں سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ بلبل کے یہ جذبات ان کے کشمیر سے والہانہ عقیدت کی غمازی کرتے ہیں:

منافق ہو گیا ہوں میں بھی انگریزوں کی صحبت میں
مری مستی ولر کی جھیل پر ہے جام لندن میں

کل شب جو نکلا بلبل خستہ بہ شوق دید
ڈوور[3] پہ یاد آگیا ولر تمام رات

ہوا کشمیر اور پنجاب میں اب تک نہ سمجھوتا
ادھر یہ کانگڑی مانگے اُدھر وہ کانگڑا سمجھے

ترے ڈھاکہ کی ململ کے اجالے اور ہوتے ہیں
مرے کشمیر کے اُجلے دوشالے اور ہوتے ہیں

حضرت بلبل کے دل کی بھی سیاحت کیجئے
دیکھئے دارالخلافہ وادیٔ کشمیر کا
جس زعفران زار سے نسبت ہے آج تک
خوشبو مرے سخن میں اسی زعفران کی ہے

---

1. باانڈی پورہ کشمیر کے نزدیک ایک خوبصورت گاؤں کا نام ہے اسی گاؤں بلبل میں پیدا ہوئے۔
2. کشمیر کے ایک بہت ہی خوبصورت جھیل کا نام
3. لندن میں واقع ہے۔ جہاں لوگ سیر و تفریح کے لئے جاتے ہیں۔

بلبل کے قطعات بھی قابل مطالعہ ہیں۔ان میں بھی ان کی نظموں اورغزلوں کی طرح انفرادیت ہے۔ان میں کوئی فلسفہ نہیں بلکہ بلبل نے عام موضوعات طنزیہ انداز میں قلم بند کئے ہیں۔ یہ قطعات ان کی ذاتی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اورحادثات کی عکاسی کرتے ہیں۔مثلاً۔

اب ہوا کے دوش پر اڑتے ہیں لوگ دو قدم دو ہاتھ کوہ طور ہے
شادیاں ہوتی ہیں ٹیلی فون پر کون کہتا ہے کہ دلی دور ہے

(دلی دور نہیں)

لفافہ خوبصورت اوردلکش تھا جو کل پہنچا
وہ قرطاس حسین دل سے لگالینے کے قابل تھا
میں سمجھا تھا مری مریم نے مجھ کو یاد فرمایا
لپک کر جب اسے کھولا تو دیکھا گیس کا بل تھا

(لفافہ)

تعلیم پانے آیا تھا میں اس خیال میں
شاید مرا شمار ہوا اہل کمال میں
کیا کہنے کیسے گزرے ہیں لندن کے چار دن
دو فیکٹری میں کٹ گئے دو ہسپتال میں

(اعلی تعلیم)

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کوئی دنیا میں ایسا بندہ ہے
لوگ تو ملک بیچ کھاتے ہیں
یہ تو اک انجمن کا چندہ ہے

(چندہ)

تو جب آتا ہے سامنے میرے
تجھ کو جھک کر سلام کرتا ہوں
سمجھتا ہے مجھ کو کبڑا ہوں
میں ترا احترام کرتا ہوں

(کبڑا)

'خندہ گل' میں چند تضمنین بھی ملتی ہے۔ یہ اقبال، اکبرالہ آبادی، ضمیر جعفری اور فیض کے اشعار پر مشتمل ہیں۔

بعض متفرق اشعار اور آئینہ خانہ، کے عنوان سے اس مجموعے کے آخر میں شاعر کی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جنہیں بلبل نے بڑے خوبصورت اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

بلبل زبان پر خاص دسترس رکھتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ نرم اور عام فہم زبان کا سہارا لے کر خیالات کو پیش کرنے کے اہل ہیں۔ 'خندہ گل' کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ انگریزی الفاظ کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کے ہاں شوخ تراکیب بھی ملتی ہے اور نئے علائم بھی۔ وہ کبھی کبھی خوبصورت تشبیہات واستعارات کو بھی خاطر میں لانے سے عار نہیں کرتے۔ ان کی شاعری میں اردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ بھی ملتے ہیں جن کو انہوں نے اپنی شاعری میں مناسب ڈھنگ سے استعمال کیا ہے۔ بریڈفورڈ، پونڈ، ہیٹر، ڈالر، میڈم، فیکٹری، بینک، سٹاف مسٹر، مس، مارکیٹ، ہیٹر، ہیٹ، واشنگٹن، ووٹ، سوپر، اسٹیشن، ٹیوب ولسن، ہارٹ فیل، بینکاک، روسٹر، پیٹرول وغیرہ جیسے انگریزی الفاظ ان کی شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں۔

بلبلؔ اگرچہ روایت پرست نہیں ہیں۔ لیکن روایت سے کنارہ کشی بھی نہیں کرتے۔ انہوں نے غالب، اقبالؔ، انیسؔ، اکبرالہ آبادی، میر کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اختر شیرانی کو بھی

پسند کرتے ہیں۔ جدید اردو شاعری سے انہیں گہرا شغف ہے لیکن وہ ایسی شاعری پسند نہیں کرتے جس میں شعریت کی کمی ہو اور جو نثر کے لبادے میں لپٹی ہوئی ہو۔ میرے ایک استفسار کے جواب میں انہوں نے جدید اردو شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا۔
جدیدیت سے اگر آپ کی مراد نئی شاعری یا نثری شاعری ہے تو میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے نئی شاعری پر ایک نظم لکھی ہے۔اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

اب کہاں پہلا ترنم شعر میں
اب ترانے ہنہناتے ہوگئے

بلبلؔ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ ان کے مطابق ہندو پاک میں اگرچہ اس زبان کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں لیکن غیر ممالک میں اس کی بڑی توقیر ہے اور یہ دنیا کی تیسری زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ایک استفسار کے جواب میں مجھے لکھتے ہیں:

میں مشرق وسطیٰ سارا یورپ اور امریکہ گھوم آیا ہوں اور دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ؎

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

غیر ممالک میں اس کا مستقبل درخشاں اور تابناک ہے اور اس وقت دنیا کی تیسری زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ البتہ اس کا مستقبل اپنے آبائی وطن میں تاریک سے تاریک تر ہوتا جارہا ہے۔"[1]

بلبلؔ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل قدر انشا پرداز بھی ہیں۔ان کی نثر بھی ان کی شاعری کی طرح مطالعے کی چیز ہے۔اس میں بھی ظرافت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ فکر کی گہرائی جا بجا ملتی ہے۔ان کی نثر پر الگ سے مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔

---

۱) بلبل کاشمیری کا ایک خط راقم السطور کے نام (ماہنامہ شیرازہ سرینگر کشمیر)

عابد مناوری

چند یادیں چند ملاقاتیں

آج دوپہر جب میں نے یہ منحوس خبر سنی کہ عابد مناوری بھگوان کو پیارے ہو گئے تو مجھ پر سکتہ سا طاری ہوا۔ کچھ دیر کے لئے یقین ہی نہیں آیا۔ معلوم ہوا تھا کہ ان کی طبیعت نڈھال رہتی ہے اور ذیابیطس کی شکایت سے کمزور ہو گئے ہیں لیکن یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہو جائیں گے اور ہزاروں چاہنے والوں کو سوگوار کر چھوڑیں گے۔

عابد ایک با صلاحیت شاعر تھے۔ میں ان کی شاعری کے توسط سے آج سے لگ بھگ پچیس برس قبل ان سے متعارف ہو چکا تھا (۱) لیکن ملاقات کا شرف کافی دیر کے بعد حاصل ہوا۔ غالباً ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ میرے چند افسانے اور ادب پارے روزنامہ آفتاب (۲) سرینگر کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہو چکے تھے اور نہ جانے اب کیوں مجھ پر شعر وشاعری کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ گھر میں والد محترم ڈاکٹر برج پریمی (مرحوم ومغفور) میری نثر کو درست کیا کرتے تھے، جب میں نے اچانک شعر وشاعری کے میدان میں قدم رکھا تو انہوں نے مجھے اپنے ایک دوست حکیم منظور کے پاس بھیج دیا۔ حکیم صاحب

---

۱) یہ مقالہ میں نے عابد مناوری کے بے وقت انتقال کے بعد قلم بند کیا۔

۲) میری پہلی نظم تارے کے عنوان سے جون ۱۹۶۸ء کے ماہنامہ پیام تعلیم دہلی میں شائع ہوئی۔

بڑی دلنواز شخصیت کے مالک ہیں[1]۔ انہوں نے مجھے شعر وادب کے رموز سے آگاہ کیا۔ ایک دن میں حسب معمول ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اوران کے ساتھ شعر وادب پر تبادلہ خیال کرتا تھا۔ کمرے میں ایک اجنبی داخل ہوئے اور ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اجنبی نہایت ہی خاموش معلوم ہوتے تھے لیکن کبھی کبھی ہماری گفتگو سن کر زیر لب مسکراتے تھے۔ جب میں تھوڑی دیر کے بعد رخصت ہونے کے لئے تیار ہوا تو قبلہ حکیم منظور نے اجنبی کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ آپ ہیں عابد مناوری گوری نندن سنگھ بالی! جموں سے کل ہی آئے ہیں۔" میرے لئے یہ جانا پہچانا نام تھا ہی۔ ان کو دیکھ کر بہار غزل[2] کے چند شعر بے ساختہ یاد آ گئے۔

اپنی اپنی نظر ہے اے عابدؔ — زندگی پھول بھی ہے کانٹا بھی
ہر گلی میں ہیں ہر زبان پر ہیں — میری دیوانگی کے افسانے
یہ غزل بھی تمہاری عابد — ہر کسی نے پسند کی ہے
میرے شعروں پہ جھوم کر عابد — داد دیتے ہیں عرش صہبائی

عابد صاحب نہایت ہی شفقت سے پیش آئے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور دعائیں دیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک عابد صاحب سے کوئی ملاقات نہ ہوسکی۔ لیکن انہوں نے اپنی شرافت سے مجھے نہال کردیا جس کے نقوش آج بھی میرے دل ودماغ پر مرتسم ہیں۔

۱۹۷۶ء میں سرینگر کے ٹورسٹ ریسپشن سنٹرل میں آل انڈیا ہندی اردو سنگم (سرینگر شاخ) کی طرف سے ایک یادگار مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس انجمن کے روح رواں میرے عزیز دوست نذیر احمد نظیر تھے اور میں نے حال ہی میں اس کی سکریٹری شپ کا چارج سنبھالا تھا۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن بھی اس انجمن کے ساتھ کچھ دیر کے بعد وابستہ ہوئے

(۱) حکیم منظور بھی چند برس قبل انتقال کر گئے۔

(۲) عابد مناوری کا پہلا مجموعہ کلام

تھے اور اس طرح سے انجمن میں نئی جان آ گئی تھی۔ چنانچہ معروف دانشور اور سیاستدان شری ڈی پی دھر (مرحوم) کی پہلی برسی کے موقعہ پر ان کے بیٹے شری وجے دھر کے اشتراک سے ایک آل انڈیا مشاعرہ آراستہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا یادگار مشاعرہ تھا۔ اس میں مقامی شعراء کے علاوہ ملک کے دور دراز شہروں سے تعلق رکھنے والے کئی نامور شعرا مدعو کئے گئے تھے۔ شہریار، فضا ابن فیضی، مخمور سعیدی، بمل کرشن اشک، مظہر امام، سلطان اختر، شام رضوری وغیرہ کے علاوہ سردار جعفری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، جان نثار اختر، راہی معصوم رضا، نشتر خانقاہی، بیکل اتساہی وغیرہ کی شرکت بھی متوقع تھی۔ اس یادگار مشاعرہ میں جموں سے عابد مناوری بھی مدعو کئے گئے تھے۔ اس بار عابد سے کافی دیر تک مل بیٹھنے کا موقعہ مل گیا۔ عابد نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی غزل پیش کی، اور داد وتحسین حاصل کی۔

عابد صاحب کے ساتھ ایک اور ملاقات یاد آ رہی ہے۔ وہ جموں کے محکمہ مالیات میں ملازم تھے۔ جو ٹاؤن ہال میں واقع ہے۔ میں چند دنوں کے لئے جموں چلا آیا تھا۔ اور اپنے چھوٹے بھائی اوناش کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا، جو اُن دِنوں سانبہ (جموں) کے ہائر سکینڈری انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت لیکچرار تعینات ہو چکے تھے۔ ایک دن آوارہ گردی کرتے کرتے بغیر اطلاع دیئے عابد صاحب کے دفتر میں پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اکاؤنٹس کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے لیکن عابد نے اسی وقت اپنی تمام سرکاری مصروفیات منسوخ کر دیں اور خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ میں ان کی باتوں سے نہال ہو گیا۔ بعد میں وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور بھابھی کی غیر موجودگی میں خود کھانا تیار کیا اور مجھے بڑے پیار سے کھلایا۔ یہ جنوری ۱۹۸۰ء کی ایک دوپہر کی بات ہے۔

۱۹۹۰ء کے المناک واقع سے متاثر ہو کر جب ہم گھر بار چھوڑ کر جموں چلے آئے، تو عابد کو بہت افسوس ہوا۔ تقریباً ہر دن اُن سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ ہر وقت مجھے افسردہ دیکھ کر میری دلجوئی کیا کرتے تھے۔ انہی دنوں میرے والد بزرگوار ڈاکٹر برج پریمی صاحب کی اچانک اور بے وقت موت نے جب میری زندگی کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیا تو

عابد کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ ہر وقت میری ڈھارس باندھتے رہتے اور مجھے آگے چلنے کا حوصلہ دیتے رہے۔

عابد صاحب کے ساتھ بے شمار ملاقاتیں میرے ذہن کے تہہ خانے میں محفوظ ہیں وہ ہر وقت محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ گزشتہ برس ان کی رفیقہ حیات انتقال کر گئیں۔ یہ صدمہ وہ برداشت نہ کر سکے۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت تنہا محسوس کرنے لگے اور اکثر بیمار رہنے لگے۔ عابد پہلے ہی ذیابیطس کے شکار تھے۔ اس صدمے نے انہیں زندگی کی ہر خوشی سے محروم رکھا اور آخر ۱۹ر ستمبر ۱۹۹۵ء کو اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

عابد مشاعروں کے کامیاب شاعر تھے۔ ریاست میں جہاں کہیں بھی مشاعرہ ہوتا تھا ان کی حاضری یقینی تھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنی غزل پیش کرتے تھے اور سامعین سے داد حاصل کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ مجھے بھی اکثر ان کے ساتھ محفلوں اور مشاعروں میں کلام پڑھنے کے مواقع ملے۔ وہ میری کافی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور جہاں کہیں بھی فنی نقائص دیکھتے تو فوراً آگاہ کرتے اور مشورہ دیا کرتے تھے۔ اس وقت ایک ایسی ہی محفل یاد آرہی ہے۔ آج سے تقریباً چار برس قبل بزم ادب جموں کی طرف سے یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ سرینگر سے معروف افسانہ نگار پروفیسر مخمور بدخشی تشریف لائے تھے۔ شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے سابقہ صدر پروفیسر منظر اعظمی علمی وادبی محفلوں کے دلدادہ تھے، ان کے کہنے پر ایک محفل شعر کا انعقاد کیا گیا جس میں راقم السطور کے علاوہ پروفیسر منظر اعظمی، پرتپال سنگھ بیتاب، محمد یٰسین بیگ، طالب ایمن آبادی و دیارتن عاصی، اسد اللہ وانی کے علاوہ کئی نو آموز شعراء نے شرکت کی۔ عابد صاحب بھی مدعو تھے۔ انہوں نے اس روز بھی اپنے مخصوص انداز میں غزل سنا کر سامعین کو سرشار کیا۔ ریاست میں جہاں کہیں بھی ادبی محفل منعقد ہوتی یا مشاعرہ کا اہتمام کیا جاتا تو سامعین اور شعراء دونوں عابد صاحب کے لئے بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔

مقامی سطح پر منعقد کئے گئے مشاعروں اور محفلوں کے علاوہ عابد ہر بار آل انڈیا مشاعروں

میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ ملک کے دور دراز شہروں سے آئے ہوئے شعراء بھی ان کا کلام سن کر محظوظ ہو جاتے۔ وہ اپنی خداداد صلاحیت کی وجہ سے نہ صرف مقامی شعراء میں بلکہ اردو کے نمائندہ جدید غزل گو شعراء میں شمار ہونے لگے تھے۔

ایک زمانے میں عرش صہبائی اور عابد کی شاعری کی ریاست میں بڑی دھوم تھی دونوں استاد فن اور معروف شاعر جناب جوش ملسیانی سے کسب فیض کر چکے ہیں۔ ایک مدت تک ان دو فن کاروں کی جوڑی سکہ رائج الوقت تصور کی جاتی تھی۔ پھر ان کے ساتھ حکیم منظور بھی وابستہ ہو گئے تو یہ ایک تکون کہلائی۔ ان تینوں شعراء نے ایک مدت تک ریاست کے ادبی دبستان میں ہلچل مچائی تھی، عرش، عابد اور منظور تینوں اردو کے نمائندہ شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز اور منفرد اسلوب کے لئے مقبول ہیں۔ عرش ملازمت سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور لکھنے پڑھنے کے کام میں منہمک ہیں۔ حکیم منظور شاعری کے ساتھ ساتھ اب صحافت سے بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اور سرینگر سے ایک ہفتہ وار اخبار نکال رہے ہیں۔(۱) عابد کے انتقال پر عرش زار و قطار روئے۔ انہوں نے عابد کا انتقال اپنا ذاتی نقصان قرار دیا۔

عابد مناوری کا خاندان نام گوری نندن سنگھ بالی ہے لیکن بہت کم لوگ ان کو اس نام سے جانتے ہیں۔ اگر چہ ان کا آبائی وطن اکھنور کا ایک چھوٹا سا گاؤں مناور ہے لیکن ان کی ولادت ۲۷رمئی ۱۹۳۰ء کو جموں میں ہوئی۔ ان کے والد رائے زادہ برکت رائے بالی ایک باذوق اور پُر خلوص بزرگ تھے۔ شرافت نفسی اور خودداری ان کی رگ رگ میں پائی جاتی تھی۔ عابد نے اس خاندانی وراثت کو زندگی بھر ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ خوددار اور غیور انسان تھے۔ عابد نے اپنی تعلیم جموں کے مقامی اسکولوں میں حاصل کی میٹرک کامیاب کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا لیکن مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ۱۹۵۸ء میں محکمہ دیہات سدھار میں ملازم ہوئے۔ جب یہ فضا راس نہیں آئی تو کچھ عرصہ کے بعد محکمہ خزانہ میں کلرک

۱) حکیم منظور چند برس قبل انتقال کر گئے۔

ہو گئے ۔ بچپن میں انہوں نے نہ جانے کون سے خواب دیکھے تھے ان خوابوں میں رنگ بھرنے کی انہوں نے اگر چہ جی توڑ کر محنت کی لیکن تقدیر کس کا ساتھ دیتی ہے ۔ اپنی تقدیر کو کوستے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

تیری تقدیر میں لکھا ہے یہی اے عابد
خواب تو دیکھ مگر خواب کی تعبیر نہ دیکھ

عابد اپنی بے پناہ محنت اور صلاحیت سے ملازمت کے دوران مختلف عہدوں پر فائز رہے لیکن ان کا کام ادبی نہیں بلکہ اکاونٹس کا تھا۔ اگر انہیں کسی ادبی ادارے میں ملازمت ملی ہوتی تو یقیناً اپنی صلاحیتوں سے انہوں نے کئی اور قابل قدر ادبی کارنامے انجام دے دیئے ہوتے لیکن یہ بھی کیا کم اہم ہے کہ وہ عمر بھر لوگوں کے حساب یعنی (اکاونٹ) درست کرتے رہے اور ان کی گتھیوں کو سلجھاتے رہے۔

عابد شروع سے ہی شاعرانہ ذہن رکھتے تھے ۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۵۸ء سے کیا ۔ ابتدائی کلام حضرت جوش ملسیانی کو دکھایا کرتے تھے جو ان دنوں اپنے تلامذہ کے سلسلے میں اکثر جموں آیا کرتے تھے ۔ عابد نے شعر و شاعری کے رموز کے سلسلے میں جوش سے پورا پورا استفادہ کیا۔ وہ ان کے استادانہ صلاحیت کے قائل تھے۔ انہوں نے اپنی کئی ابتدائی غزلوں میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

دھوم ہے جو کلام عابد کی
جوش صاحب کا فیض پیہم ہے

عابد کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۶۱ء میں بہار غزل کے نام سے شائع ہوا ۔ یہ مجموعہ ان کی غزلوں پر مشتمل ہے ۔ اس مجموعے کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ یہ غزلیں نہایت ہی مختصر بحور میں کہی گئی ہیں ۔ اگر چہ ان غزلوں میں روایتی رنگ غالب ہے لیکن عابد نے اپنی فنکارانہ چابکدستی ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دی ۔ حضرت جوش کو بھی اپنے اس شاگرد پر بڑا فخر تھا۔ وہ عابد کی خداداد صلاحیت کے قائل تھے ۔ اپنے شاگرد کے کلام پر داد دیتے ہوئے بہار غزل

کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں۔

''بہارِ غزل' عابد مناوری کے کلام کا مجموعہ ہے۔ عابد صاحب میرے ہی عزیز اور میرے ہی دامن ادب سے وابستہ ہیں۔ میں ان کے حسن عاقبت اور ذوق شعری کا مداح ہوں جو کچھ کہتے ہیں کافی سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں تو ان کی شگفتہ بیانی ہر شعر کو شاخ گل بنا دیتی ہے۔''

'بہار غزل' کی غزلیں اگر چہ روایتی انداز میں کہی گئی ہیں لیکن اس میں بعض ایسے خیالات ملتے ہیں جن میں انفرادیت ہے۔ عشق و عاشقی کی رنگا رنگی عابد کے اس دور کی غزلوں میں نمایاں طور پر ملتی ہیں۔ اس موضوع کو عابد نے شروع سے ہی نئے انداز سے برتا ہے۔ وہ بھی محبوب کی جفا اور عاشق کی وفا کی بات کرتے ہیں۔ ہجر کا درد اور وصل کی لذت محسوس کرتے ہیں۔ گل کی چٹک اور بلبل کے نغمے نے انہیں شروع سے ہی سرشار کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیاوی مسائل پر بھی توجہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق ایک انسان کو اس دنیا میں خوشیاں کم اور مایوسیاں اور نامرادیاں زیادہ ملتی ہیں۔ عابد بھی دنیا کے ان مسائل سے دوچار ہیں۔ انہوں نے ہر قدم پر ٹھوکر کھائی ہے لیکن ہنس ہنس کر مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کیا ہے۔ وہ ایک حساس شاعر تھے۔ ان کی نگاہ ہر ایک مسئلے پر رہتی تھی کبھی کبھی جب وہ مکمل طور پر بے بس ہو جاتے تھے تو میخانے کی راہ اختیار کرتے تھے اور اپنا غم غلط کرنے کے لئے دو چار گھونٹ پی لیتے تھے۔ ان خیالات کی تصدیق وہ خود اپنے اشعار میں کرتے ہیں۔ مثلاً

جس نے دنیا میں حق پرستی کی — اس کو جینے دیا نہ دنیا نے
واقعی اس میں زندگی ہے — ہم نے پی کر بھی دیکھ لی ہے
کھول دے میکدے کا در ساقی — غمزدوں کی برات آئی ہے
تلخ باتیں ہمیں پسند نہیں — جو بھی پوچھو وہ پیار سے پوچھو

تیری آنکھیں ہیں وہ مقام جہاں   مے پرستی بھی مات کھاتی ہے
حاصل زندگی ہیں وہ لمحات   جو تیری بزم میں گزارے ہیں

شمیم گل کے نام سے عابد کا ایک اور مجموعہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں غزلوں کے ساتھ ساتھ ان کی نظمیں، قطعات اور چند رباعیات بھی شامل ہیں۔ جہاں تک ان غزلوں کا تعلق ہے، یہاں ان کی زبان میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ اُن کی زبان فارسی آمیز اور تراکیب قدرے مشکل نظر آتی ہیں لیکن اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ شعر کا حسن برقرار رہتا ہے۔ شمیم گل، میں بعض غزلیں گیت کے فارم میں بھی ملتی ہیں۔ یہ غزلیں نرم لچکیلی ہیں لیکن اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہیں۔ مثلاً

کس نے مجھ کو یاد کیا ہے   دل کا اک اک زخم ہرا ہے
میں تجھ کو تو مجھ کو جانے   میرا تیرا بھید ہی کیا ہے
سب کی اپنی اپنی نظریں   کون اچھا ہے کون برا ہے
گہرا ساگر چنچل لہریں   جیون کاغذ کی نیا ہے
میری غزل وہ سن کر بولے   عابد شاعر البیلا ہے

ایک اور غزل اسی لب و لہجے میں ملاحظہ کیجئے

دھرتی کا ہر چپہ درپن   اس کا جلوہ آنگن آنگن
کس کے ہجر میں جوگ لیا ہے   بول اے شومندر کی جوگن
بس اک پیار کا پھول کھلا تھا   پھر کانٹوں سے بھر گیا دامن
اس کی دید کو آنکھیں ترسیں   جس کا جلوہ آنگن آنگن
پھر کوئی یاد آیا عابد   پھر اشکوں سے تر ہے دامن

'شمیم گل' میں عابد ایک مختلف زاویئے سے سامنے آتے ہیں۔ اس میں غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں کی کیفیت بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ ابھرتی ہے۔ خمریات کے موضوع پر شمیم گل میں جو اشعار ملتے ہیں۔ ان میں زیادہ تازگی اور توانائی ملتی ہے۔ عابد

بھی جگر کی طرح جب میخانے کا رُخ کرتے ہیں تو ناصح کی باتوں کو عمل میں لانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ عابد پینے کے بڑے شوقین ہیں۔ وہ پینے سے یک گونہ بے خودی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اگر دنیا مٹ بھی جائے لیکن ان کے ہونٹوں سے ان کا پیمانہ ہر گز جدا نہیں ہوسکتا ہے بلکہ خمریات کے موضوع پر وہ جگر کی طرح اپنا ایک الگ نظریہ رکھتے ہیں۔ مثلاً

مے خانے میں یک لمحہ فرصت کسے حاصل
اے شیخ یہاں قصہ ترا کون سنے گا
حضرت واعظ بلا سے وعیظ فرماتے ہیں
میرے ہونٹوں سے کبھی ہوگا نہ پیمانہ الگ
شیخ بھی ناخوش ہے اے عابد برہمن بھی خفا
اور ہے ناراض سے پیرِ مے خانہ الگ
بے خودی میں اس طرح چھلکا گئے پیمانہ ہم
ہوگئے ہیں باعث صد رونق مے خانہ ہم

''شمیم گل'' میں بہار غزل کی طرح ہلکے پھلکے اشعار بھی ملتے ہیں لیکن عابد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فکروفن پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ وہ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی سلاست اور روانی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین 'شمیم گل' پر تبصرہ کرتے ہوئے عابد کی شاعری کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''عابد نے ہلکے پھلکے اشعار کہے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ان میں بڑی صفائی روانی اور بندش کی چستی پائی جاتی ہے۔ اس نوعمری میں الفاظ کی دروبست کو اس خوش اسلوبی سے نبھانا قابل داد ہے۔ وزن اور قافیے کی قیود نے بھی انہیں تعیقد لفظی

پر مجبور نہیں کیا۔ ہر بات بڑی قدرت کے ساتھ کہتے ہیں'' (۱)

''شمیم گل'' میں چند نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ان نظموں میں بھی خاص انفرادیت جھلکتی ہیں تو کہیں وہ تو نہیں، کلرک کی رُوداد، گیتا نجلی سے، رنگ و مستی، ک کے نام، شب غم، شکوہ اہل شکوہٗ اہل اُردو، دعوت جہد، اے مادر ہندوستان، وقت، سسکیاں، آہ نور پوری، معذور، ہم لوگ، دعوت فکر و عمل، اعتراف، میرا وطن، صرف چند نظمیں ہیں جن سے عابد کا ایک اور رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ اگر چہ عابد نظم کے شاعر نہیں لیکن پھر بھی ان کی نظمیں بڑی جاندار ہیں اور فکر و نظر کی دعوت دیتی ہیں۔ ان نظموں میں عابد کا خلوص جگہ جگہ ٹپکتا ہے۔ وہ حقائق دریافت کرنے میں اور ان کو بروئے کار لانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ ان میں سے بعض نظموں کا موضوع تضاد اور ٹکراؤ ہے۔ یہ تضاد اور ٹکراؤ امیر، غریب، کسان، مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان ہے جس کو عابد نے بڑی خوبی کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ بعض نظمیں غزل کے فارم میں ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) ان نظموں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''عابد بھی اکثر نوجوان سخن سنجوں کی طرح، ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر رہے۔ کچھ نظموں میں انکے یہاں امیر و غریب، کسان و مزدور اور سرمایہ دار کی زندگی کے تضاد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (۲)

کلرک کی رُوداد عابد کی ایک نمائندہ نظم ہے۔ اس میں عصری آگہی کا عرفان ملتا ہے۔ اس نظم میں مفلسی اور لاچاری کی پوری داستان منقش ہے۔ ایک کلرک کے لباس میں عابد اس نظم کے ذریعے سے تمام ملازم طبقہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ ایک طنزیہ نظم ہے۔ وہ سماج کے کھوکھلے نظام پر طنز کرتے ہیں۔ نظم کے درج ذیل اقتباسات عابد کے اس نظریئے کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

(۱) شمیم گل۔ عابد مناوری۔ ص ۲۳

(۲) کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ) پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) ص ۱۳۸

عادتاً آپ غم اُٹھاتے ہیں | لوگ تقدیر خود بناتے ہیں
لیجیئے گا یہ نوٹ دس کا ہے | کیس میرا بھی دو برس کا ہے
آپ سلجھائیں گے اگر اس کو | آپ کو دوں گا دس کے اور دو
شام کو جب میں نکلا دفتر سے | دل میں دلچسپ سے ارادے تھے
پہلے سوچا کہ بار میں جاؤں | جام و مینا سے دل کو بہلاؤں
اور مس ناز کا سنوں گانا | میں وہیں کھاؤں رات کا کھانا
نو بجے فلم ہی کوئی دیکھوں | رات بارہ بجے میں گھر پہنچوں

پھر خیال آیا کیوں نہ گھر جاؤں | اور بیوی کو ساتھ لے آؤں
وہ بھی خوش بخت سیر کرے گی | دونوں ہوں گے تو خوب گزرے گی
گھر کا سامان کچھ خریدوں گا | خرچ کر کے فضول کیا لوں گا
جو ضرورت کے وقت کام آئیں | ایسے پیسے فضول کیوں جائیں

'شکوہ اہل اردو عابد کی ایک اور نمائندہ نظم ہے۔ یہ بظاہر ایک طنزیہ نظم ہے جس میں عابد اردو زبان کو مشترکہ تہذیب اور کلچر کی علامت قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اردو کی تعلیم اور تدریس سے ہمارا نظام رنگوں سے بھر گیا ہے۔ اردو والوں نے اس زبان سے زندگی کے حسن کو اور بھی دوبالا کیا ہے لیکن افسوس کہ موجودہ دور میں اس زبان سے پیار اور محبت کرنے والے ہی معاشی بدحالی، مفلسی اور لاچاری کی چکی میں پس گئے ہیں اور قسم قسم کی مشکلات اور مصائب کا شکار ہو گئے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار موثر ڈھنگ سے کرتے ہوئے عابد کہتے ہیں۔

خلوص وشوق سے خونِ دل وجگر کے ساتھ
نئی حیات کے خاکوں میں ہم نے رنگ بھرا

ہزار حیف ! ہمیں یہ صلہ دیا تم نے
ہمیں سے مکروتغافل ہمیں یہ ظلم وجفا

دعوتِ جہد، اے دل زار، وقت وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں تکرار اور تضاد کی کیفیتیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عابد خود اس انتشار اور کشمکش میں گرفتار ہوئے ہیں۔ اور ان خیالات اور تجربات کو نظم کی صورت میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کشمیر کی خوبصورتی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اردو شعرا کے ایک لامتنہی سلسلہ ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات کے حوالے سے کشمیر کے حسن کو خراج پیش کیا ہے۔ عابد جیسے فنکار بھلا خاموش کیسے رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی اور میرا وطن کے نام سے ایک قابل قدر نظم لکھی۔ وہ اپنے مادر وطن پر فخر کرتے ہیں اور اس کے حسن کی تعریف کرنے میں رطب اللسان ہیں۔ دیکھیئے کس طرح نظم کا آغاز کرتے ہیں:

اس پہ حیران ہوکر اکثر دوست کرتے ہیں سوال
ہم کو بھی تو یہ بتا، ہے کون سا تیرا وطن
کون سی وہ سرزمیں ہے ہم ذرا یہ جان لیں
جس کی مٹی نے نکھارا ہے تیرا فکر وفن
کون سی وہ وادیٔ گلپوس ہے یہ تو بتا
جس کی رعنائی میں چمکا ہے تیرا رنگ سخن
دوست جب یہ پوچھتے ہیں فخر ہوتا ہے مجھے
تمکنت سے کہتا ہوں کشمیر ہے میرا وطن

''شمیم گل'' میں چند قطعات اور رباعیات بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ بھی رنگارنگ موضوعات پر دال ہیں۔

'برجستہ' عابد کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ یہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں

۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۸۲ء تک کا کلام شامل ہے۔ برجستہ کی غزلیں نہ بہار غزل کی غزلوں کے رنگ میں ہیں اور نہ شمیم گل کی بلکہ ان کا ایک الگ رنگ اور خوشبو ہے عابد نے اگر چہ روایتی شاعری سے شعر گوئی کا آغاز کیا لیکن 'برجستہ' تک آتے آتے وہ تخلیق کے بہت سے مراحل سے گزر چکے ہیں۔ وہ جدید شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے وہی رنگ اور روش اپنائی جو ان کے معاصرین اختیار کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں بھی انہوں نے جداگانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ ''برجستہ'' کی بعض غزلوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، شہر یار، بانی اور وزیر آغا کا رنگ بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ عابد کے ان شعروں پر غور کیجئے تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس حد تک اپنے ان معاصرین سے متاثر ہو چکے ہیں۔ مثلاً،

پہلے خود آگ لگا دی گھر کو　　خود ہی اب محو تماشا ہوں میں
کیا کہوں میں کس امتحان میں تھا　　قید خود اپنے ہی مکان میں تھا
بوند مانگی تو سمندر پایا　　پھر بھی حیرت ہے کہ پیاسا ہوں میں

کھیت بنجر، پیڑ ننگے، سب کنوئیں بے آب ہیں
جب سے پکے ہو گئے گاؤں کے کچے راستے
کہیں یہ اندھا سمندر نگل نہ جائے مجھے
اپنی ہی بات لگتی ہے خود بھی گراں مجھے
ہر دن بدلنا پڑتا ہے اپنا بیاں مجھے
چاروں طرف فضا میں ہے بکھرا ہوا دھواں

یہ اشعار عابد کی شاعری کے فنی جہتوں کا ثبوت فراہم کرتے ہیں:

''برجستہ'' کی غزلیں علامتوں سے مالا مال ہیں۔ اس میں عابد نے زمانے کے درد و کرب کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ کہیں کہیں ان کا لہجہ طنزیہ بھی ہو گیا ہے۔ لیکن انکے مخصوص لہجے اور ڈکشن سے یہ طنز لطیف احساس کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ برجستہ میں عابد نئی صاحتوا ، کے ساتھ

سامنے آتے ہیں۔ یہ غزلیں شبنم سے دھلے ہوئے پھول کی مانند اپنی تازگی بکھیرتی ہوئی قاری کو خوش آمدید کہتی ہیں۔ ان میں جہاں فکر وخیال کی بلندی ہے وہاں نغمگی اور لوچ برابر ملتی ہے۔ عابد جذبے کے شاعر ہیں۔ وہ ہر وقت نئے جذبات کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے ہیں اور نئے تقاضوں کو برتنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ خوشنما اردو الفاظ اور تراکیب کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کا استعمال ان کی غزلوں نیا رنگ وآہنگ پیدا کرتے ہیں ؎

میرے آنگن میں بھی اے قوس قزح! اک دن اُتر
زندگی میں ترا اک اک رنگ بھرنا ہے مجھے

عابد کے بعض اشعار میں ہندی دیو مالا اور اساطیر کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہے۔ انہیں کرشن جی اور سری رام چندر جی سے گہری عقیدت ہے۔ عابد ایسے کئی واقعات اپنے اشعار میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن کا تعلق کرشن جی اور رام چندر جی کی سیرت پاک سے گہرا ہے۔ کئی جگہوں پر وہ بدی پر نیکی کی فتح کا منظر پیش اور پھر علامتی اسلوب اختیار کرکے اپنی بات کو واضح کرتے ہیں۔ عابد کبھی بھکشو بن کر چراغ جلنے سے پہلے ہی اپنی گپھا میں پہنچ جاتے ہیں اور کبھی شنکر کا دھیان کرکے وہ گنگا کو اپنی جٹاؤں میں چھپا لیتے ہیں۔ کبھی وہ سچ بولنے کے پاداش میں قابل سزا ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اور کبھی اس دور کا سداماں بن کر کرشن کی تلاش میں دردر بھٹکتے ہیں۔ کبھی راس رچانے کے لئے گوکل کا رُخ کرتے ہیں اور کبھی گوپیوں کے ساتھ اٹکھلیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عابد کی اس طرح کی شاعری ان کے ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے اور ان کے تجربات سے لطف اندوز ہو جائیے۔

دہلیز پر چراغ جلاتے ہو کس لئے
بھکشو پلٹ کے جا بھی چکے ہیں گپھاؤں میں

ملی ہے یہ سزا سچ بولنے کی
زبان پر ان گنت چھالے پڑے ہیں

میں اس دور کا سداماں ہوں در بہ در عابدؔ
کہاں ہے کرشن مرا جو گلے لگائے مجھے !
پیروی گوتم کی کرنا اس قدر آسان نہیں
زندگی کو چشمِ عبرت سے کبھی دیکھا نہ کر
جن چراغوں سے اٹھ رہا ہے دھواں
آندھیوں سے وہی لڑے ہوں گے
اے دل ساری دنیا جھوٹی سارے دنیا والے جھوٹے
بس اک پیار کا بندھن سچا باقی رشتے ناتے جھوٹے
خود اپنی ہی کستوری کی خوشبو سے بے کل
انجانے میں آہو لیکن ہر جانب بھٹکے
دل کی نگری میں وہ پل بھر ہنسنے ہنسانے آیا تھا
جیسے گوکل میں اک چھلیا راس رچانے آیا تھا

عابدؔ ایک حقیقی شاعر تھے۔ان کی شاعری میں قوس وقزح کی طرح بے شمار رنگ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ وہ الفاظ کی دروبست پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ان کے ہاں علامت نگاری، پیکر تراشی اور تشبیہات واستعارات کے ساتھ ساتھ خوشنما تراکیب بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ابھی چند برس قبل انہوں نے لکھا تھا۔

میں آندھیوں سے لڑوں گا یہ میں نے سوچا تھا
ہوا کا ایک ہی جھونکا بجھا گیا مجھ کو

لیکن افسوس کہ آندھیوں سے لڑتے لڑتے عابد خود آندھیوں کا شکار ہو گئے اور ہوا کے ایک ہی جھونکے نے انہیں ہم سے چھین لیا۔(ماہنامہ ''شیرازہ'' سرینگر) جلد۳۵۔شمارہ ۱۰۔۹

(۱) شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی جموں اور انجمن ترقی اردو جموں کی طرف سے یک روزہ عابد سیمینار میں ۲۴ر دسمبر ۱۹۹۶ء کو شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں میں پیش کیا گیا۔

امر چند ولی کاشمیری کی شاعری

اُردو زبان وادب نے اگرچہ ریاست جموں وکشمیر سے بہت دور جنم لیا ہے لیکن اس میں اتنی لطافت اور شیرینی ہے کہ یہ زبان شروع سے ہی یہاں کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہماری ریاست میں عدالتی اور دفتری زبان کا درجہ پانے میں کامیاب ہوئی۔ اس میں اتنی لوچ اور لچک ہے کہ اس نے ایسے ان گنت قلم کار پیدا کئے ہیں جنہوں نے اپنے خون جگر سے اس زبان کو سینچا۔ اقبال، چکبست، دیا شنکر نسیم، سرشار، تربھون ناتھ ہجر، علامہ کیفی، آغا حشر کاشمیری، آنند نرائن ملا، راما نند ساگر، قدرت اللہ شہاب، چراغ حسن حسرت، اللہ رکھا ساغر، سعادت حسن منٹو، رفیق خاور کے ساتھ ساتھ کشمیر میں رہ کر جن کشمیری قلم کاروں نے اس زبان کی آبیاری کی۔ ان میں پریم ناتھ پردیسی، دیا کرشن گردش، ملک راج صراف، نرسنگھ داس نرگس، گنگا دھر بٹ دیہاتی، ویر ویشیشور، طالب کاشمیری، کشن سمیلپوری، تیرتھ کاشمیری، شام لال ایمہ، شہہ روز کاشمیری، مرزا کمال الدین شیدا، شاہد کاشمیری، میر غلام رسول نازکی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ افسوس کہ ان میں سے بہت سے قلم کاروں، شاعروں اور ادیبوں کو یکسر فراموش کیا گیا ہے اور اس طرح سے ان کے فن پاروں پر وقت کی دھول جم گئی ہے۔ پنڈت امر چند ولی کا نام ایسے ہی قلم کاروں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

پنڈت امر چند ولی ۱۹۰۰ء میں سرینگر کے محلّہ بڈی بار بالا میں پیدا ہوئے۔ ان کے

والد پنڈت سمسار چند ولی ریاست کے واٹر سپلائی محکمہ میں ملازم تھے۔ امر چند ابھی آٹھ برس کے ہی تھے کہ ان کے والد انتقال کر گئے۔ لہٰذا ان کے بنائے ہوئے خواب ایک ایک کر کے بکھر گئے۔ بچپن عالم بے کسی میں گزرا۔ انہیں دو روپے ماہوار اجرت پر مہاراجہ ہری سنگھ کے ٹینس بوائے کے طور پر کام کرنا پڑا۔ امر چند کو لکھنے پڑھنے کا بچپن ہی سے شوق تھا لیکن والد کے انتقال کے بعد جب گھر پر افلاس و ناداری کے سائے منڈلانے لگے تو انہیں تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا اور وہ ساتویں درجے تک ہی تعلیم حاصل کر سکے۔ اس کے بعد انہوں نے امر سنگھ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، سرینگر میں داخلہ لیا۔ یہاں پانچ سال تک بت تراشنے ڈرائینگ اور مصوری کی تربیت حاصل کرتے رہے۔ انہیں تربیت کے دوران بہترین کارکردگی دکھانے پر آٹھ روپے ماہوار وظیفہ ملتا رہا۔ اپنی محنت لگن اور صلاحیت سے وہ قلیل عرصے میں اس فن کے ماہر ہو گئے۔ تربیت سے فارغ ہونے کے بعد پنڈت جیا لال کول ناظر کی سفارش پر وہ سناتن دھرم سکول پشاور میں ڈرائینگ ماسٹر ہو گئے۔ (۱) یہاں وہ ایک سال تک کام کرتے رہے، پھر جگت جیت ہائی اسکول پھگواڑہ میں ۳۴ روپے ۵۰ پیسے ماہوار تنخواہ پر تقریباً ڈھائی سال تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

پنڈت امر چند ولی کو اپنے وطن مالوف کشمیر سے گہرا لگاؤ تھا۔ ملازمت کے دوران کئی برس تک وہ وطن سے دور نہایت ہی پریشان حالی اور کسمپرسی کی حالت میں رہے۔ آخر کچھ عرصہ کے بعد انہیں ریاست جموں و کشمیر کے محکمہ تعلیم میں بحیثیت آرٹ ٹیچر تعینات کیا گیا۔ وہ پچیس سال تک جموں و کشمیر کے مختلف تعلیمی اداروں میں آرٹ کی تربیت دیتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے بحیثیت آرٹ ٹیچر کے پنڈت امر چند ولی بہت مقبول تھے۔ ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد کشمیر کے مختلف غیر سرکاری تعلیمی اداروں نے ان کی خدمات حاصل کرنے کے لئے ان سے رجوع کیا۔ وہ نو برس تک ڈی اے وی اسکول رعناواری میں کام کرتے رہے۔ ولی صاحب ۱۹۸۰ء میں ۸۰ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

۱) ولی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر جو راقم السطور کے پاس محفوظ ہے۔

امر چند ولی اپنے دور کے ایک اچھے سخن ور تھے۔قلیل تعلیم کے باوجود بھی وہ اردو ، کشمیری اور فارسی زبان وادب پر دسترس رکھتے تھے۔وہ اردو کے ساتھ ساتھ کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے۔کشمیری میں ان کا ایک مجموعہ ''میخانہ ولی'' کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ان کی اردو شاعری بھی پڑھنے کی چیز ہے۔غزل، نظم، قطعہ، رُباعی، مخمس ،ترجیع بند وغیرہ جیسے اصناف پر ولی صاحب کو پوری گرفت حاصل تھی۔انہوں نے دیوان غالب کا کشمیری میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے، جو عنقریب ہی شائع ہو رہا ہے۔انہوں نے غالب، اقبال اور جگر کے اشعار پر تضمینیں بھی لکھی ہیں ولی مرحوم نے شریعہ بھاگوت گیتا کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے۔انہوں نے یوگ اور سائنس پر بھی ایک کتاب لکھی ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔

ولی کاشمیری بچپن سے ہی موسیقی سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔مختلف منڈلیوں اور محفلوں میں موسیقی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی آواز سے بھی جادو جگاتے تھے اور معاصرین میں عزت وتوقیر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ولی کے پسندیدہ اور محبوب شعرا میں غالب کا نام سرفہرست ہے۔وہ بچپن سے ہی ان کی غزلیں ہارمونیم پر گایا کرتے تھے۔ان کی غزلوں کو ساز اور آواز دینے سے ہی ان کی طبیعت شعر وشاعری کی طرف مائل ہوئی۔علم عروض کی جانکاری بھی انہیں غالب کے کلام کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوئی ۔ وہ شاعری میں خیالات کے ساتھ ساتھ وزن اور بحر کے بھی زبردست قائل تھے۔ چنانچہ خود ایک جگہ پر لکھتے ہیں۔

> ''جس شاعری میں سنگیت نہ ہو اور جس سنگیت میں شاعری نہ ہو، وہ ادب عالیہ نہیں ہے۔میری شاعری سنگیت سے شروع ہوگئی ہے۔میں غالب کی غزلیں ہارمونیم میں بجایا کرتا تھا۔اسی سے میری شاعری کی ارتقاء ہوئی۔(ا)

ا) ولی مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تحریر سے جو راقم السطور کے پاس محفوظ ہے۔

ولی کی شاعری رنگارنگ موضوعات پر دال ہے۔ انہوں نے روایتی رنگ کو بھی اپنایا ہے اور نئے نئے خیالات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ شاعری میں وہ غالب اقبال اور حالی سے خاص طور پر متاثر تھے۔

ولی مرحوم کے کلام کا دور متعین کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کی کسی بھی دستیاب تخلیق پر کوئی بھی تاریخ درج نہیں ہے۔ البتہ رسائل واخبارات کے پرانے فائل دستیاب ہونے پر اس کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ ان کی غزلیں اور نظمیں عام طور پر ماہنامہ تعمیر، سرینگر روزنامہ مارتنڈ، سرینگر، جیوتی، سرینگر، ماہنامہ 'شیرازہ' سرینگر اور ہمارا ادب (سرینگر) کے پرانے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ولی صاحب کے بیشتر فن پارے مسودات کی شکل میں ان کے لواحقین کے پاس محفوظ ہیں جن کو شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

ولی صاحب ایک درویش صفت انسان تھے انہیں شروع سے ہی ویدانت سے خاصی دلچسپی تھی جس کی جیوت ان کے دل میں شری گنیش داس جی نے جلائی تھی، جو کہ ان کے مرشد تھے۔ ولی (مرحوم) اگرچہ ہندو دھرم پر اعتقاد رکھتے تھے لیکن ہر ایک مذہب کا احترام کرنا ان کا شیوہ تھا۔

ولی اپنے دور کے ایک قابل شاعر تھے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی رباعیات بھی اور قطعات بھی۔ لیکن غزل اور رباعیات میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ ولی کی غزل میں جہاں ایک طرف حسن وعشق کے جذبات کی عکاسی ملتی ہے وہاں دوسری طرف ہجر ووصال کے مضامین بھی بڑے لطیف انداز پیش کئے گئے ہیں۔ ان کی غزل نہ صرف انہی جذبات واحساسات کی ترجمان ہے بلکہ اس میں انسان کے درد وکرب کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں حزن وملال کے جذبات کے ساتھ ساتھ حیات وکائنات کے مسائل بھی اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) ولی کی غزل میں بیان کا لطف اور اسلوب کی چاشنی محسوس کرتے ہیں۔ انہیں ان غزلوں میں جدید عصری رجحانات کی جھلک بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ چنانچہ اپنی

کتاب میں ولی کی شاعری کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''ولی کی غزل میں بیان کا لطف اور اسلوب کی خوبی خاص طور پر نمایاں ہے اور غزل کی روایت کی پابندی کے ساتھ ساتھ جدید عصر کے رجحانات کی جھلک بھی اس میں ملتی ہے۔ولی کی طبیعت میں ایک دبا دبا سا مزاج بھی ہے جو ان کی غزل کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔(۱)

سروری صاحب کے اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں۔انھوں نے ولی مرحوم کی غزل گوئی کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ولی کی غزل کی انفرادیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں، اسی کو الفاظ میں ڈھال کر شعر کی صورت میں پیش کرنے کے روادار ہیں۔مثلاً

برق بن کر جو جلاتا اے جنون نارسا
ایک قطرہ آنسوؤں کا بھی شرارا نہ ہوا
کیا بات تھی بگڑ کے یہ کیا بات ہوگئی
دن وصل کا تھا ہجر کی پھر رات ہوگئی
شبِ فرقت ہیں داغِ ہجراں
ہوا ہے دیدہ دل میں چراغاں
وقت عسرت مے کے بدلے ساقیا
پی رہا ہوں جام انجم رویا کیے
نشیمن شاخ گل پہ اب کہاں ہیں
نہیں میرا کہیں اب آشیاں ہے

۱) کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ) پروفیسر عبدالقادر سروری، ص ۳۲۶

جمہور کی سحر سے نئی ضوفشاں کرن
پھوٹی تو نذرِ گردشِ حالات ہوگئی

ولؔی مرحوم کی زندگی غم والم کی داستان ہے۔ وہ چھوٹی سی عمر میں والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئے، جوان ہوئے تو بے روزگاری کی چکی میں پس گئے۔ شادی ہوئی تو رفیقہ حیات نصف راستے پر ہی ساتھ چھوڑ گئی، پھر یکے بعد دیگرے ان کے بچوں کی موت واقع ہوئی یعنی انہوں نے جس راہ پر بھی چلنے کی کوشش کی ناکامیوں اور محرومیوں نے گھیر لیا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ ان مصائب کا ہنس ہنس کر مقابلہ کیا جو ان کے راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

ابتداء میں مفلسی تھی انتہا میں بے کسی
درمیاں میں مفلسی و بے کسی تھی، بے بسی
غم غلط کرنے کو ہم نے چن لیا الفت کا غم
جذبۂ الفت نے آخر ہم کو بخشی بے حسی

اس ضمن میں ان کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں جن میں تلخی بھی ہے اور محرومی بھی۔ حسرت بھی ہے اور مایوسی بھی درد بھی ہے اور کسک بھی۔

پیئے ہیں خونِ دل کے جام رنگیں رات بھر ہم نے
خمارِ غم کے موجوں کو بھلا میخوار کیا جانیں
گرم آنسوؤں سرد آہوں اور نالوں کے سوا
زندگی کا ایک لمحہ بھی گزارا نہ گیا
مرے زخمِ جگر دیتے تصور کیا گلستاں کا
ہوئے ہیں داغِ دل روشن چراغاں ہے دبستاں کا

ولی کی غزلوں کا ایک اہم موضوع عشق ہے، ان کی غزلیں پڑھ کر ان کے عشق کا واضح تصور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کے مطابق عشق کا میدان بہت وسیع اور دشوار گذار

ہے جس کو سر کرنا آسان بات نہیں۔ ولی اس میدان کو پار کرنا چاہتے ہیں لیکن منزل مقصود تک پہنچنے سے محروم ہیں۔ اس حال میں بھی وہ مایوس نہیں ہوتے بلکہ صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں۔ وہ آنسو بھی بہاتے ہیں اور مشکلات کا ہنس ہنس کر مقابلہ بھی کرتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے بلکہ ان کی جستجو جاری ہے۔ مثلاً

عشق میں ہم کو ملا کیا اے ولی
ہر قدم پر ہم صنم رویا کئے
عشق میں ہر گام پہ ہنس ہنس کر رویا ہم نے
خون دل سے داغ دل ہر بار دھویا ہم نے
فروغ حسن سے روشن ہوا ہے عشق کا عالم
ظہور حسن کی نزہت دل پندار کیا جانیں
عمر گزاری عشق کے مذہب میں روتے روتے
پر نہ آیا ہے ابھی داغوں کو خنداں ہونا

ولی کی غزلوں میں موضوعات کی کمی نہیں۔ ان کے ہاں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ ایسے بھی موضوعات ملتے ہیں جن سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ویدانیت سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ولی صوفیوں، سنتوں اور فقیروں سے لگاؤ رکھتے تھے۔ خود بھی ایک درویش صفت آدمی تھے اور گرو گنیش جی کے قدموں میں روحانی درس حاصل کر چکے تھے۔ گرو جی کی صحبت میں رہ کر ان کی نگاہیں کھل گئی تھیں۔ وہ ظاہر و باطن کا فرق جاننے لگے تھے۔ ان کی شاعری میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، کہتے ہیں۔

سوز آدم زندگی ہے نور عالم بندگی
بندگی ہی زندگی ہے سوز آدم زندگی

میں ہی بندہ میں خدا تھا مجھ کو معلوم نہ تھا
میں ہی خود ذات بقا تھا مجھ کو معلوم نہ تھا
یوگ کے آئینہ خانے میں ہوا جب جلوہ گر
میں ہی بندہ میں خدا تھا مجھ کو معلوم نہ تھا
حق وباطل کا تماشا مجھ میں جب تھا یہ مخفی
میں ہی دنیا میں ہی عقبیٰ مجھ کو معلوم نہ تھا
عالم فانی ہے دنیا کیا روانی ہے یہ دنیا
ہے یہ آنی جانی دنیا اک کہانی ہے یہ دنیا

امر چند ولی کی نظمیں بھی قابل مطالعہ ہیں ان میں چھوٹی اور مختصر نظمیں بھی ہیں اور طویل نظمیں بھی۔ یہ نظمیں قومی اور ملی موضوعات پر بھی ہیں اور سیاسی اور سماجی موضوعات پر بھی۔ بعض نظموں میں حب الوطنی کے جذبات ملتے ہیں۔ عام موضوعات پر ان کی بعض نظمیں بہت ہی دلچسپ ہیں۔ دردِ غم، وہم، میکدہ، تحفہ غم، انجام، سحر، گیان امرت ہلال چاند، شوراتری، عقیدت کے پھول، گرد سفر، مرحوم دل، ایک شام وغیرہ جیسے موضوعات پر کہی گئی ولی کی نظمیں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں جہاں غمِ دوراں و غمِ جاناں کی جھلکیاں ملتی ہیں وہاں ان میں بیسویں صدی کے انسان کا آشوب بھی ملتا ہے۔

ولی نے صوفیوں اور سنتوں پر بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں ان کی شاعری کا ایک اور پہلو نمایاں کرتی ہیں۔ للّی ایشوری، وویکانند جی، شری سوامی رام تیرتھ، گرودیو، رام چندر جی، کرشن جی وغیرہ کی شخصیات اور ان کے روحانی کمالات پر ولی اپنی نظموں میں بھرپور روشنی ڈالی ہے اور سنجیدگی سے ان صوفیوں اور سنتوں کا اپنے مؤثر انداز میں جائزہ لیا ہے۔ ان نظموں میں اگرچہ فکر کا عنصر تلاش کرنا عبث ہے لیکن پھر بھی ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ولی کی نظموں میں اقبال کا آہنگ بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ وہ غالب کے ساتھ ساتھ اقبال سے بھی گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اقبال کے بعض موضوعات انہیں اس قدر عزیز تھے کہ وہ ان پر خوشہ چینی کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ آفتاب، انسان زندگی، تنہائی، شاعری، ایک شام، شکوہ، پیام، چراغ، انجام، سحر، ہلال، عید وغیرہ جیسے اقبال کے عزیز ترین موضوعات پر ولی مرحوم نے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں اقبال کا آہنگ جا بجا ملتا ہے۔

اک خدا ہے اک خدائی ایک یہ انسان ہے
عالم حیرت میں غلطاں کیوں ابھی انسان ہے
ہیں کتابوں میں تری جنگ وجدل کی داستاں
ہے ہوس کی کشمکش سود و زیاں کی داستان
(انسان)

عشق کے سرتاج تم تھے وجد کے تھے بادشاہ
عالم مستی کے سوامی تم بنے تھے درس گاہ
عالم وجدان کا ان پہ پڑا تھا وہ اثر
مست وہ بھی ہو گئے تھے حور وغلماں مہر وماہ
اک کرشمہ ہے نفی ہستی تماشا خانقاہ
راز محرم ہو گئے تھے راز غم کے بادشاہ
(سری سوامی رام تیرتھ جی مہاراج)

رات کے آغوش میں بیدار آوارہ ولی
شاعری سے کر رہا ہے درد دل کی دلبری
انکشافی راز میں پرواز میں سوئے عدم
جا رہا ہے چاک کر پرواز کی پردہ دری

چاند کی کھیتی میں بوتا ہے کواکب ہر گھڑی
عزلتِ شب میں یہ ہی ہے درد دل کی پردری
(شاعر)

امر چند ولی نے غزل اور نظم کے ساتھ ہی ساتھ رباعیات اور قطعات پر بھی خاصی توجہ کی ہے۔ یہ رباعیات اور قطعات کافی تعداد میں ان کے غیر مطبوعہ کلام میں ملتے ہیں۔ ان میں ایک خاص قسم کا رنگ جھلکتا ہے۔ ولی کے بعض رباعیات محبت اور اخوت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہیں۔ ان میں غم دوراں اور غم جاناں کی مرقع کاری بھی ملتی ہے اور انسان کے درد و کرب کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ ولی اپنے رباعیات کے بارے میں خود رقمطراز ہیں۔

شاعری کی ارتقاء ہوکر ہوئی ہے مختصر
میری غزلیں میری نظمیں اب رباعیاں ہوگئی

ولی اگرچہ بات کہنے کا پرانا انداز رکھتے ہیں وہ کبھی کبھی مشکل الفاظ کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ دور از کار تراکیب کا بھی۔ یہ عمل ان کی غزلوں اور نظموں کے ساتھ ہی ساتھ ان کی رباعیات میں بھی ملتا ہے۔ لیکن ولی کی غزلوں اور رباعیات میں ہی ان کے فن کا اصل جوہر دیکھا جاسکتا ہے۔

(ماہنامہ، تعمیر، سرینگر۔ جلد ۲۷، شمارہ۔ اپریل، مئی ۱۹۹۷ء)

عنوان چشتی کی غزل

اردو ادب میں بعض ایسے مشاہیر پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کو بھی اپنی جولانگاہ بنایا اور اس کو تازگی اور توانائی بخشی ، غالب ، اقبال ، حالی اور اس طرح بیشمار فنکاروں کو چھوڑ کر اس صدی میں جن قلمکاروں نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کے گلستان میں قسم قسم کے رنگ بھر دیئے ان میں آل احمد سرور ، احمد ندیم قاسمی ، علی سردار جعفری ، مسعود حسن خاں ، نعیم صدیقی ، کالی داس گپتا رضا ، شمس الرحمٰن فاروقی ، وحید اختر ، وزیر آغاز ، باقر مہدی ، شمیم حنفی ، جگن ناتھ آزاد اور خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ ایسے ہی فنکاروں کی صف میں پروفیسر عنوان کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے ۔ عنوان چشتی نے عکس و شخص ، اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ، معنویت کی تلاش ، اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت ، تنقیدی سے تحقیق تک ، تنقیدی پیرائے وغیرہ جیسی قابل قدر تصانیف لکھ کر اردو تنقید و تحقیق کے میدان میں ایک مخصوص جگہ بنائی ہے اور اپنی سادہ طرز نگارش اور سلیس و دلکش اسلوب سے تنقید کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی رنگ آمیزی کی ہے اور جدید شعراء میں نام پیدا کیا ہے ۔

پروفیسر عنوان چشتی نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۴۹ء سے کیا ۔ ابتداء میں ٹوٹے پھوٹے لیکن بامعنی اشعار کہے ۔ ۱۹۵۰ء میں پہلی غزل کہی جو جناب رام کرشن مضطر کے توسط سے روزنامہ ملاپ دہلی میں شائع ہوئی ۔ یہ عنوان کے لئے نہایت ہی حوصلہ مند قدم

تھا۔لیکن ۱۹۵۱ء میں انہیں یکا یک احساس ہوا کہ وہ شعر کہہ سکتے ہیں جب ان کی نظم 'سلام اے مسافر، ماہنامہ شاعر بمبئی میں شائع ہوئی۔ اور تا حال برصغیر ہندو پاک کے رسائل واخبارات میں مسلسل چھپتے رہے۔عنوان کی شاعری کو نکھارنے اور سنوارنے میں ان کے گھریلو ماحول کا زبردست ہاتھ رہا ہے ، ان کے دادا حضرت شاہ سید نورالحسن چشتی نور منگلوریؒ والد حضرت شاہ سید انوارالحسن چشتی انوار منگلوریؒ عم مکرم حضرت شاہ اسرارالحسن چشتی راز منگلوری، بھی اپنے دور کے صوفی ، بزرگ ، درویش صفت اور شاعر تھے۔عنوان کی والدہ ماجدہ کی طبیعت بھی موزون ہے اور وہ کلا یکی شاعری سے خاصا لگاؤ رکھتی ہیں۔ان بزرگوں اور اساتذہ فن کے خیالات نے عنوان کے فن میں بھی وسعت پیدا کردی اور ان کے قلم میں تازگی اور توانائی پیدا ہوئی۔ دوسری طرف عنوان صاحب شروع ہی سے دردمند دل اور ذوق نغمہ لے کے آئے تھے۔وہ عالم طفلی میں لوری، نغمہ رنگ و آہنگ اور موسیقی سے دل بہلایا کرتے تھے۔ چنانچہ جس حساس آدمی کے پاس یہ تمام سہولیات میسر ہوں تو وہ شاعری کی طرف گامزن کیوں نہ ہو۔ پروفیسر عنوان چشتی اپنے شعری محرک کے بارے میں ڈاکٹر ابن کنول کے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں۔

> ''جہاں تک محرکات یا اسباب وعلل کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ قسام ازل نے مجھے شروع ہی سے دل دردمند اور ذوق نغمہ کی دولت عطا کی تھی۔میری والدہ ماجدہ نے اس بات کو بار بار جتایا کہ میں عالم طفلی میں لوری نغمہ سنجی اور موسیقی سے بہلتا تھا۔ہوش سنبھالنے کے بعد یہی ذوق نغمہ نے ذوق سماع اور فکر سخن کی آبیاری کی۔''

تقسیم ملک کے واقعات بھی عنوان کے دِل پر گراں گزرے۔ چونکہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ملک بھارت کی ثمر بار تہذیب کے پروردہ ہیں۔اس لئے وہ ملک وقوم کے نہایت ہی ابتر حالات سہہ نہ سکے۔اُن کا شعور اس وقت بیدار ہونے لگا جب انگریز نے ۳۱ ، ملک

میں نفرت کا زہر پھیلا دیا تھا۔ ہر طرف قتل و غارت، خونریزی، فرقہ وارانہ فسادات اور بربریت کا بازار گرم تھا۔ عنوان یہ سب کچھ نہ دیکھ سکے۔ ان کے دل پر ان تمام حالات کے اثرات منقش ہونے لگے اور شاعری کے رنگ میں ڈھلنے لگے۔ ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں:

"میں ۱۹۴۸ء میں درجہ ششم کا طالب علم تھا۔ گھر میں فرقہ وارانہ فسادات کا روزانہ ہی ذکر رہتا۔ لوگوں پر ایک خوف اور دہشت کا آسیب مسلط تھا۔ ایک روز اچانک خبر آئی کہ ایک میلے میں ایک فرقہ کے ہزاروں بے گناہ افراد کو ظالموں نے تہہ تیغ کر دیا ہے۔ میرے دل پر اس دل خراش حادثہ کا بے حد اثر ہو۔"

یہ دردناک اور دلخراش واقعات عنوان کے تحت الشعور میں اب تک بھی رچے بسے ہوئے ہیں۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں۔

میں درد و کذب میں سچی زبان چاہتا ہوں
فسادِ شہر پہ واضح بیاں چاہتا ہوں

ایک اور جگہ پر واضح الفاظ میں اس کا تاثر یوں پیش کرتے ہیں۔

جب برا وقت پڑا تو مجھے معلوم ہوا
میرا دشمن تھا مرے سائے میں پلنے والا
جوامنِ شہر کے ضامن ہیں کرفیو میں وہی
سنا یہ ہے کہ بہت قتلِ عام کرتے ہیں۔

عنوان چشتی کی شاعری گل و بلبل کی شاعری نہیں بلکہ اس میں ایک خاص قسم کا امتزاج پایا جاتا ہے جو انہیں نئی شاعری کی صف میں ایک قابل قدر مقام دلاتا ہے۔ ان کے ہاں نہ تو جنسی مسائل کی کارفرمائی ملتی ہے اور نہ طول کلامی، بلکہ ان کی غزلیں رواں دواں اپنی ارتقائی منزلوں کو طے کرتی ہوئی آگے چلی جاتی ہیں۔ عنوان کی غزلوں میں جدیدیت کے ساتھ

ساتھ کلاسیکی شاعری کی لوچ اور گداختگی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اسی لئے وہ غزل کی جمالیات میں اس کی ہیئت کو خاص اہمیت دینے کے درپے ہیں۔ غزل کی تخلیق میں کلاسیکی نظم وضبط اور فنکارانہ جمال کا ایک خاص تصور ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ چنانچہ ان تمام باتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"میں غزل کی جمالیات میں اس کی ہیئت کو خاص اہمیت دیتا ہوں اس لئے کلاسیکی نظم وضبط اور فنکارانہ جمال بھی میرے پیش نظر رہتا ہے۔ آتش نے شاعری کو مرصع سازی کا فن کہا تھا۔ وہ غلط نہیں تھا۔ اچھی شاعری کے لئے اچھے اور سچے افکار وجذبات کے ساتھ بہترین اور موزون اسلوب بیان بھی ضروری ہے۔ جس کے لئے عروضی اور لسانی نیز فنی چابک دستی بھی ضروری ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ عنوان چشتی کی شاعری آج کے بیشتر جدید شعراء کی طرح قاری کو گمراہ نہیں کرتی اور یہ ابہام کا راستہ اختیار نہیں کرتی بلکہ اس میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی کا زیر وبم پیدا ہوتا ہے اور قاری اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ممکن ہو تو کچھ اشک ہی آنکھوں میں بچا لو
سنتے ہیں کہ اب شہر میں پانی نہ ملے گا

یہ کیسا شخص ہے کیوں جنگلوں کی بات کرتا ہے
کہ اس سے شہر کی شائستگی دیکھی نہیں جاتی

ڈوبنے والا ڈوب رہا ہے اور یہ کہتا جاتا ہے
اس کی آنکھوں کی جھیلوں کا پانی کتنا میٹھا ہے

فلک کی سمت نہ دیکھو افق کی بات کرو
سنا ہے چاند زمین پر اترنے والا ہے

سنا ہے میرا دشمن آئینے سے خوف کھاتا ہے
کہ اس سے اپنی ہی بے چہرگی دیکھی نہیں جاتی

عنوان چشتی کی غزلیں اپنے معصوم انداز اور رویے سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں، ان میں احساس کا تیکھا پن اور برجستگی ہے۔ عنوان کی غزلوں میں معنوی تہہ داری کے ساتھ ساتھ الفاظ کا برمحل استعمال بھی ملتا ہے۔ اس میں ایک بے نام سادرد زخموں کی ان گنت ٹیسیں غم کی عجیب لذت تھرکتی ہوئی ملتی ہے۔ عنوان کے ہاں درد، غم اور مایوسی سہنے کا گہرا شعور ملتا ہے مگر مایوسی اور نامرادی کے حصار میں بھی وہ ایک باشعور انسان، جس کو زندگی کی تلخیوں نے پارہ پارہ کردیا ہے اپنے ضبط وقناعت کے سہارے سے ٹوٹ کر نہیں رہ جاتا بلکہ اسے خودشناسی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی پر آدمی کے قہر نے انہیں ظلم، حق تلفی، ناانصافی معاشی ناہمواری، فرقہ پرستی، زرگری اور کمزوری اور غریبوں کے استحصال، خودغرضی اور مکروریا سے متنفر کیا ہے۔ چنانچہ ان تمام باتوں کا احساس اپنی غزلوں میں یوں دلاتے ہیں۔

وہ لوگ روح کی ویرانیوں کو کیا سمجھیں
جو خشک جھیل کو چشم پُر آب کہتے ہیں

مجھ کو جو نور حق سے ہے حصہ ملا ہوا
دل بجھ گیا ہے پھر بھی ہے چہرہ کھلا ہوا

ہماری تشنہ لبی پر نہ جا کے ہم اکثر
سمندروں کو بھی جوئے کم آب لکھتے ہیں

غلط ہے یہ کہ تو شبنم ہے یا شرارہ ہے
ترا جمال محبت کا استعارہ ہے

میں کہ سورج نہیں ہر شام کو ڈھلنے والا
ہوگیا راکھ مرے سائے سے جلنے والا

عنوان چشتی کی شاعری میں حیات وکائنات کے مسائل ، انسانیت کی الجھنیں اور معاشرے کا کرب اپنے پورے تب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار میں طنز بھی ہے اور تیکھا پن بھی۔ وہ کبھی سماج اور سوسائٹی پر طنز کرتے ہیں۔ کبھی سیاسی ٹھیکہ داروں پر اور کبھی مذہبی کارندوں پر۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنے آپ کو بھی کبھی کبھی طنز کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔

عنوان کا لہجہ بڑا نرم ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی گرانباری یا ثقالت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ وہ بالکل ملائم الفاظ میں بات کہنے کا گر رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں میر اور غالب کے ساتھ ساتھ فیض کا رنگ بھی جھلکتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہیں کہیں ناصر کاظمی ، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ابن انشا کا رنگ بخوبی پہچانا جاتا ہے۔ جہاں عنوان کے بعض اشعار میں نرگسیت کا احساس ہوتا ہے وہاں ڈرامائی عنصر سے بھی ان کے اشعار خالی نہیں خود کلامی کا جذبہ بھی ان کے اشعار میں کہیں کہیں بروئے کار آیا ہے۔ مثلاً

دل بالک ہے بالک ناداں دل کی بات پہ رونا کیا
پیار کی راہ میں اس نے ابھی تو پہلی ٹھوکری کھائی ہے

تم چاہو تو نذر کروں میں تم جو کہو تو پیش کروں
ایک وہی ٹوٹا ہوا دل ہے کوئی نئی سوغات نہیں

دل آئینہ ہے اس میں سنور کیوں نہیں جاتے
تم چاند ہو پھر چاند نگر کیوں نہیں جاتے

بھیڑ میں اکیلے ہیں ، جیسے چاند تاروں میں
اپنی ذات میں لیکن انجمن ہیں صوفی جی!

ذوق نظر مجبور کرے ہے کرنوں کی پیمائش پر
خالی آنکھیں یہ کہتی ہیں چاند نگر سے کچھ بھی نہیں

عنوان چشتی کی غزلوں میں اشاریت ، سادگی ، شخصی جذبات اور عصری تقاضے بھی پائے جاتے ہیں۔ان کی غزلوں میں ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ درد وکرب کا پہلو بھی ملتا ہے۔ وہ تشبیہات اور استعارات سے معنی ومفاہیم کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے ہیں بعض جگہوں پر وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔عنوان کی غزلوں میں علامت سازی اور تمثیل نگاری کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ان کے ہاں شہر، دل، گھر، شخص، محبت، سناٹا، سفر، سمندر، آگ، خوشبو، قتل، زندگی، سورج، شبنم، روشنی، پتھر، نظر، دشت، دریا، تنہائی، دھوپ وغیرہ جیسے الفاظ کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ وہ ان الفاظ کے ذریعے سے نہ جانے کتنے پیکروں کو زندگی بخش دیتے ہیں۔ یہاں پر اشعار مثال کے طور پر پیش کرنے بے محل نہ ہوں گے۔

جنگل کی فضائیں بھی دلآویز ہیں لیکن
جنگل کے لئے شہر کو چھوڑا نہیں جاتا

مجھ کو جو نورِ حق سے ہے حصہ ملا ہوا
دل بجھ گیا ہے ، پھر بھی ہے چہرہ کھلا ہوا

آنگن سے مرے روز ابھرتا ہے نیا چاند
لیکن یہ رخ جان سحر کس کی طرف ہے

میرے گھر سے اس کے گھر کا فاصلہ کوئی خاص نہ تھا
وہ بھی پانی مانگ رہا ہے جس نے آگ لگائی ہے

جو تم ہو ساتھ تو چاروں طرف اجالا ہے
اب اس سفر میں کسی اور کی ضرورت کیا

جمال وجسم کا پھر سحر چلنے والا ہے
سنا ہے رات کو سورج نکلنے والا ہے

لہو لہو جو مرا سر مجھے دکھائی دیا
خود اپنے ہاتھ میں پتھر مجھے دکھائی دیا

الفاظ کے معاملے میں بھی عنوان کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ وہ کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہنے کے قائل ہیں۔ یہ خصوصیت ان کے تنقیدی افکار میں بھی ملتی ہے۔ فنکار کا یہ برتاؤ فن میں خود بخود نکھار لاتا ہے۔ عنوان کی شاعری میں ایک اور خصوصیت اردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے ملائم الفاظ کا استعمال ہے۔ ان کی غزلوں میں تن من اور رتجگوں، سپنے، بجھائیو، بالک، نگر، دھوپ، کرن، آنگن، ٹھٹھن، پردیس، جل، آنچ، چنچل، گوری، سرذی، کلی، رس، بھونرا وغیرہ جیسے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اردو اور ہندی کے اس طرح کے سنگم نے ان کی شاعری میں اور بھی مٹھاس اور نغمگی پیدا کی ہے۔ عنوان کے ہاں نئی اور جاندار تراکیب کا استعمال بھی ملتا ہے۔ حضور عشق، نظام نو، حیات نو نقش کامل، شام انتظار، انجمن شمشاد، سوزِ جگر، اہل سفر، چشم پُرفن، نقاب رُخ، تکمیل تمنا، دل زار، تصویر صبح کامگار زیست، دورِ نو، انداز جنون، امن ساحل وغیرہ صرف چند تراکیب ہیں۔ جن کے استعمال سے عنوان کی شاعری میں برجستگی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً

نظام نو کا تلون حیاتِ نو کا جمود
انجمن شمشاد قداں میں دیوانوں کی بات چلی
کہ جی گھبرا گیا سیر چراغ زیر داماں سے
زیب آغوش محبت ہی محبت ہوگی
اعلانِ حق کو کہتا ہے عہدِ کہن کی بات
ساحل تک آتے ہی رخ طوفان بدل گیا
یہ دشت دشتِ انا ہے یہاں ہے کوئی
یہ فردِ جرم نہیں ، خود نوشت ہے میری

ذوق جمال اور نیم باز کے نام سے عنوان چشتی کے دو شعری مجموعے اب تک منظر عام

پر آچکے ہیں۔ ذوق جمال میں ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۵ تک کا کلام ملتا ہے۔ اگر چہ یہ عنوان چشتی کا ابتدائی کلام ہے۔ لیکن پھر بھی ان غزلوں میں لطافت اور چاشنی برقرار ہے۔ اس دور کی شاعری میں اگر چہ زیادہ توجہ عشق حسن ہجر، وصال، سرکشی، بغاوت اور انقلاب وغیرہ جیسے موضوعات پر ہے لیکن پھر بھی ان میں جدت کا عنصر غالب ہے۔ عنوان چشتی کا دوسرا شعری مجموعہ 'نیم باز' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں میں برجستگی کے ساتھ ساتھ گہرائی اور گیرائی بہ درجہ اتم پائی جاتی ہے۔ محاورات کا برمحل استعمال، تشبیہات واستعارات کی حسن کاری اور تراکیب کو خوبصورتی سے پیش کرنے کا ڈھنگ عنوان کے اس دور کی شاعری کا حاصل ہے۔ اس دور میں ان کے اشعار بالکل صاف، واضح اور پرمعنی ہیں۔ عنوان چشتی سے کہیں کہیں چوک بھی ہوئی ہے۔ ان کی غزلوں میں نئے اور پرمعنی الفاظ اور تراکیب کے ساتھ ساتھ بعض متروک الفاظ اور دور از کار تراکیب بھی دیکھنے میں آتی ہیں جن سے ان کی غزلوں میں کہیں کہیں تخیل کی پرواز کم ہوگئی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان کی غزلیں مطالعے کی چیز ہیں۔ عنوان نے چند نظمیں بھی کہی ہیں لیکن وہ اول سے آخر تک غزل کے شاعر ہیں۔ عنوان چشتی ایک قابل قدر نقاد بھی ہیں، اس لئے فن کارانہ زاویہ نگاہ سے شعر کو جانچنے پرکھنے اور برتنے کے فن سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں، اور یہی کیا کم ہے۔

ماہنامہ تعمیر سرینگر، جلد ۲۲، شمارہ ۶ / فروری، مارچ ۱۹۹۳ء

جدید اُردو شاعری اور اقبال

اقبالؔ کے معاصرین میں بڑے قد کے شاعر، ادیب، عالم اور مفکر ہوئے ہیں جنہوں نے شعر و ادب کے دائرے میں یا اِس دائرے سے باہر کافی کارنامے انجام دیئے۔ ان میں بعض لوگ اپنے اپنے شعبوں میں منفرد حیثیت کے مالک تھے لیکن اس کے باوصف اقبالؔ اپنے فکر و فن کی دولت کی بدولت ایک بڑے فنکار ثابت ہوئے، جنہوں نے کسی نہ کسی طرح نہ صرف اپنے معاصرین بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کیا۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے ایک خط میں اقبالؔ کی بصیرت کی تحسین کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> ''آپ کی نظم میں نے پڑھی، ماشاءاللہ چشم بدور۔ بعض اور بزرگوار بھی تھے۔ سب نے تعریف کی لیکن مجھ پر بہت اثر ہوا۔ وہ اثر باعثِ سکون خاطر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشم بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلا تجربہ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم، اخلاقی حقائق کی طرف ہے۔''(۱)

یا اسی طرح محمد علی جناح کے ایک خط میں ذیل کے جملے قابل توجہ ہیں:۔

(۱) ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ بحوالہ اقبالؔ سب کے لئے۔ ص۔ ۵۰۹

"اگر میری زندگی میں ہندوستان میں اسلامی ریاست قائم ہوگئی اور مجھے اپنے اعزاز کے انتخاب کا حق دیا گیا تو میں اسلامی ریاست کے نگران اعلیٰ بننے پر کلام اقبالؔ کو ترجیح دُوں گا۔" (۱)

ان اقتباسات سے علامہ کے افکار اور فنی عظمت کے قبول عام اور اثرات کا ہلکا سا اشارہ ہوتا ہے۔

شعروفن میں علامہ کے افکار وخیالات اور فنی تجربوں کے اثرات علامہ کی شاعری کے ابتدائی دور سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ بڑے بزرگ شاعروں مثلاً سرور جہاں آبادی، نادر کاکوروی، پنڈت برج نرائن چکبست سے قطع نظر شاعروں کی ایک پوری نسل ہے جنہوں نے علامہ سے کسی نہ کسی حیثیت سے اکتساب فیض کیا۔ اُن شعراء میں سیماب، امین حزین، جگر مراد آبادی حفیظ جالندھری، اثر صہبائی، آنند نرائن مُلا اور شورش کاشمیری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اقبالؔ کے یہ اثرات اُن شعراء کے یہاں موضوع، مواد، ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے نظر آتے ہیں۔ اقبال سے متاثر ہونے والے شعراء نے نہ صرف مختلف شعری تجربوں میں اقبال کی تقلید کی بلکہ اقبال نے جن موضوعات کو بطورِ خاص پیش کیا تھا، اُن موضوعات پر اُن لوگوں نے بھی اپنا اظہار خیال کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال سے متاثر ہونے والے شعراء نے نہ صرف مختلف شعری تجربوں میں اقبال کی تقلید کی بلکہ اقبال نے جن موضوعات کو بطور خاص پیش کیا تھا، ان موضوعات پر ان لوگوں نے بھی اپنا اظہار خیال کیا یہ صحیح ہے کہ اقبال سے قبل بھی مغرب کی تقلید میں شاعری کو ایک نئی نہج عطا ہوئی تھی لیکن ان میں اس قدر ہمہ گیری، وسعت اور تنوع پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ کام اقبال کے ہاتھوں انجام پایا۔ اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ انسانی مسائل کو فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ پیش کرنا رہا ہے۔ اقبال رجائیت کے شاعر تھے اور انہوں نے اپنی شاعری کو انسانی زندگی کے ساتھ پیوست کر کے پیش کیا۔

---

۱) اقبال ریویو، جلد ۱۷، جنوری ۱۹۷۷ء، نمبر ۴، ص ۵۹

فنی اعتبار سے بھی وہ ایک ترقی پسند ذہن رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے بھی اس میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں صنائع و بدائع کی طلسم کاری کے بجائے فکر کی گہرائی ملتی ہے۔ اس دھاگے کو لے کر دوسرے شاعروں نے اس کو آگے بڑھایا اور ان نقوش میں رنگ آمیزی کی جو اقبال نے چھوڑے تھے۔

اقبال سے متاثر ہونے والے فنکاروں میں سیماب اکبر آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ سیماب نے اقبال کے فلسفیانہ تفکرات میں سے خودی، عشق، عقل، حیات و کائنات، حسن، انسان، خدا وغیرہ کو لیا اور ان پر اپنا اظہار خیال کیا۔ یہ صحیح ہے کہ سیماب فلسفیانہ تفکر کے اعتبار سے اقبال سے بہت پیچھے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کو وہ لب ولہجہ حاصل نہ ہو سکا جو صرف اقبال کا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ان موضوعات کو برتنے کی قابل قدر کوششیں نظر آتی ہیں۔ سیماب بھی علامہ کی طرح عشق کو عقل سے برتر سمجھتے ہیں اور یہ خیال یقیناً اقبال سے مستعار لیا گیا ہے۔ سیماب کے مطابق عاقبت اصل زندگی ہے اور یہ زندگی محض ایک تجربہ گاہ۔ اس خیال کا ایک منضبط اظہار اقبال کے یہاں ملتا ہے۔ سیماب خدا کی ذات پر بھروسہ کرنے کا درس دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی اقبال کی طرح خودشناسی کا درس بھی دیتے ہیں۔ ان مباحث پر اظہار بہ ذاتِ خود اقبال کی فکر کے اثر کا نتیجہ ہے۔ اتنا ہی نہیں سیماب نے اقبال کی تقلید میں وطنی اور قومی شاعری بھی کی ہے۔ سیماب کے یہاں ایسے خیالات کی کمی نہیں ہے جہاں وہ مغربی شاعروں کی چالبازیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اقبال ہی کی طرح اپنے اہل وطن کو بغاوت کے آداب سکھاتے ہیں اور فرنگی چالوں سے خبردار کرکے انہیں آمادۂ پیکار کرتے ہیں۔ بغاوت کی یہ تپتی ہوئی آگ اقبال کے اثرات کا ہی نتیجہ ہے۔

سیماب کی شاعری میں ایک اہم رجحان مناظر فطرت کی عکاسی ہے۔ مرغزاروں کی کتنی ہی لازوال تصویریں سیماب کے یہاں نظر آتی ہیں جن کا ذکر اقبال کے یہاں بھی بطور خاص ملتا ہے۔ سیماب بھی انسان کو فطرت کے بغیر نامکمل سمجھتے ہیں۔

سیماب کی نظمیہ شاعری کا ایک بڑا حصہ فلسفیانہ افکار پر محیط ہے۔ ان کی نظم فریاد، شکوہ کے رنگ میں اور اسی لب و لہجے میں ملتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے تئیں بھی احترام اور عقیدت کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ خاص طور پر دوسرے مذاہب کے اماموں کی تعریف و توصیف کی ہے۔ چنانچہ رام چندر جی، گورنانک، مہاتما بدھ وغیرہ پر انہوں نے خوبصورت نظمیں لکھیں۔ سیماب کے یہاں بھی ایسی نظمیں ملتی ہیں اور یہ اقبال کے ہی اثرات کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے سری کرشن، گوتم بدھ اور گورونانک جیسی نظمیں لکھیں جن میں اقبال کی نظموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اقبال کی نظمیہ شاعری کا وقیع حصہ بچوں کی نظموں پر محیط ہے اور انہوں نے نہایت ہی آسان بحور میں آسان الفاظ کے تانے بانے سے بچوں کے نغمے گائے ہیں جن میں بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ سیماب یہاں بھی اقبال کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ دعا، بچوں کی دعا، بلبل اور گلاب، جگنو اور بچہ، برسات جیسی ہلکی پھلکی نظمیں اقبال کے بچے کی دعا، شمع، جگنو وغیرہ کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

سیماب کے یہاں جو فنکاری ملتی ہے۔ اس پر بھی اقبال کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فنی سطح پر بھی سیماب، اقبال کی بلندی پر پہنچ نہیں پائے لیکن سیماب بھی علایم، پیکر تراشی، تراکیب اور تشبیہ و استعارے کے استعمال سے وہی سماں باندھنے کی کوشش کرتے ہیں جو اقبال کرتے ہیں۔ سیماب کے یہاں لالہ صحرا، بانگ جرس، خودی، راز ہستی، آدم خاکی، شاخ گل، نور آفتاب، عرش بریں، موج دریا، نوائے عشق اور ایسے بے شمار علائم و استعارے ملتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیماب نے فنی سطح پر بھی اقبال سے اکتساب فیض کیا ہے اور اسے اپنے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

امین حزیں نے شاعری کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگرچہ انہوں نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی لیکن وہ علامہ سے ضرور متاثر رہے ہیں[1]۔ امین حزیں کی شاعری کا ایک بڑا موضوع تصور خودی ہے۔ اگر ان کا راستہ

---

(۱) اقبال ریویو: جلد ۱۷، جنوری ۱۹۷۷ء، نمبر ۴، ص ۵۹

اقبال کے راستے سے الگ ہے۔ امین حزین نے اپنے اشعار میں اثبات خودی کا بار بار اظہار کیا ہے۔ اور وہ بھی علامہ کی طرح ضبط نفس کو انسانی بہبود کا لازمہ قرار دیتے ہیں لیکن وہ اقبال کے نظریئے سے اس درجہ اختلاف کرتے ہیں کہ وہ ایقان کے نظریئے کے قایل نظر آتے ہیں اورا اقبال خودی کے مبلغ۔ وہ خودشناسی کے ساتھ ساتھ یقین محکم پر بھی زور دیتے ہیں اور اس طرح سے ایقان کو خودی سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اقبال اور امین حزین کے یہاں عمل کے تصور کی وضاحت بار بار ملتی ہے۔ دونوں ہی ذوق عمل پر زور دیتے ہیں۔ امین حزیں اس تصور کے سلسلہ میں اقبال سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ ان کی واضح طور پر تقلید کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ تقدیر پرستی کے خلاف ہیں اور ایسے لوگوں کو بے عمل قرار دیتے ہیں جو صرف تقدیر کا رونا روتے ہیں۔ یہ سبق اُنہوں نے یقیناً اقبال سے حاصل کیا ہے۔

اقبال کا ایک اہم تصور نظریہ حیات و کائنات ہے جس کے لئے وہ مسلسل کشمکش کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ امین حزیں کا مطالعہ اگر چہ اقبال کی طرح اس قدر گہرا نہیں، پھر بھی وہ اپنے انداز میں انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو اقبال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اقبال ہی کی تقلید میں وہ طریقۂ خانقاہی اور سکونِ گوشہ نشینی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

امین حزین، اقبال سے اس درجہ متاثر تھے کہ انہوں نے شعوری طور پر اقبال کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی اور اپنے انداز میں وہی مفکرانہ لہجہ پیدا کرنے کی کوشش کی جو علامہ سے مخصوص ہے چنانچہ وہ بہت سی ایسی تراکیب استعمال کرتے ہیں جو اقبال کو پسند تھیں۔ جیسے قصۂ ناتمام، دامن گلشن، حسن فطرت، نور سحر یا علایم میں حسن، خودی، عمل، حیات وغیرہ۔ امین حزیں کے یہ علایم یا استعارے کسی حد تک انہیں اقبال کے لب و لہجے میں بات کرنے کا شرف بخشتے ہیں اور اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے میں کامیاب کرتے ہیں۔

اگر چہ امین کا کلام بہت مختصر ہے لیکن اُن کی شاعری کے تیور دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے شعوری طور پر علامہ کے اثرات نہ صرف قبول کئے تھے بلکہ ان کو جذب کر کے

اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

اقبال سے متاثر ہونے والوں میں جگر مراد آبادی بھی شامل کئے جاسکتے ہیں جگر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے اپنی غزلوں کو محض عشق و عاشقی کے روایتی موضوعات تک محدود نہیں رکھا۔ ان کے یہاں فکری اور فنی لحاظ سے کئی ایسی باتیں ملتی ہیں جو اقبال کا راست اثر معلوم ہوتی ہیں۔ آل احمد سرور کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جگر کا تصور عشق اگر چہ اقبال کے تصور کی گہرائی کو نہیں پہنچتا مگر لطافت میں اقبال سے کم نہیں۔ عشق اقبال کا ایک زبردست موضوع ہے جسے وہ وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں ساری کائنات کی رونق عشق کی بدولت ہے۔ جگر بھی عشق کی تشنہ کامی کیلئے زہر کو آبِ حیات سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے عشق کی بات کرتے ہیں جو وصول سے نہیں بلکہ ہجر سے شادمانی حاصل کرتا ہے۔ یعنی محبوب سے غرض نہیں بلکہ حسن کے شعلے سے اپنے عشق کا الاؤ روشن رکھنا مقصود ہے۔

اقبال کی طرح جگر مراد آبادی بھی حسن پرست ہیں۔ اگر چہ شروع شروع میں ان کے یہاں حسن کا تصور بالکل روایتی ہے لیکن بعد میں وہ حسن مطلق کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ اقبال زندگی کے شاعر ہیں اور وہ زندگی میں جوش، ولولہ اور ہنگامہ چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اسے امروز و فردا کے پیمانے سے نہیں ناپتے۔ جگر نے اقبال کے دوسرے تصورات کی طرح زندگی کے تصور کے بارے میں اقبال سے فیضان حاصل کیا ہے۔ وہ جنوں سے نفرت اور حرکت سے محبت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ موت پر زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جگر کا تصور زندگی فلسفے کی آنچ میں تپا ہوا نہیں ہے لیکن اس بات میں دورائیں نہیں کہ جگر زندگی کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ جگر نے زندگی کی حرارت کا یہ سبق اقبال سے ہی سیکھا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اقبال غزل کے ساتھ ساتھ نظم کے ذریعے اپنی بات کہتے ہیں اور جگر نے ان باتوں کا ذکر غزل کے رمز و کنایے میں کیا ہے۔ عقل کا تصور بھی اقبال سے ہی متاثر نظر آتا ہے۔ جگر عقل کو عشق سے کم تر درجہ دیتے ہیں۔ اسی

(۱) جگر مراد آبادی: آتش گل، ص ۴۸

طرح حیات وکائنات کے بارے میں جگر کا خیال یہ ہے کہ زندگی کرنے کے لئے درد وغم کا جذبہ ہونا لازمی ہے۔ جگر کا خیال ہے کہ آرزو کا نغمہ ہو تو حیات بھی رقص کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جگر مرادآبادی نے جن تراکیب کا استعمال کیا ہے ان میں بیشتر ایسی ہیں جو جگر سے پہلے اقبال کے یہاں ملتی ہیں۔ حسن سراپا، سکوتِ شوق، مقام عشق اور اسرار محبت، فکر حیات، آفتابِ شوق، موجِ طوفان، نورِ حیات اور ایسی ہی کتنی تراکیب ہیں جو کلام اقبال سے حاصل کی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکن جنھوں نے کلام جگر میں نئے مفاہیم پیدا کئے۔

اقبال کے بعد کی نسل میں حفیظ جالندھری کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ حفیظ کی شاعری جہاں اکبرالہ آبادی، چکبست، جوش، اختر شیرانی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی اور جگر کے رنگ سے متاثر ہے وہاں علامہ کی آواز اور ان کے رنگ کو ان کے یہاں اچھی طرح سے پہچانا جاسکتا ہے۔ حفیظ اپنے بچپن سے ہی علامہ کی شاعری سے متاثر ہی نہیں تھے بلکہ ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے جب شعر کہنا شروع کیا تو اقبال سے اس درجہ متاثر تھے کہ ان کے رنگ سخن کو اپنانے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ اس کا اظہار حفیظ نے اپنے اشعار میں خود بھی کیا ہے۔ اقبال کے تئیں اپنے عقیدت کے بے شمار پھول نچھاور کرنے کے ساتھ حفیظ نے موضوع اور ہیت کے اعتبار سے اقبال کے رنگ وآہنگ کو شعوری طور اپنانے کی کوشش کی۔ حفیظ کی شاعری کا ایک رنگ مناظر فطرت کا ہے۔ فطرت کے جلوۂ صد رنگ کی حشر سامانی کا ذکر جس طرح حفیظ کے یہاں نظر آتا ہے۔ وہ اقبال کے نغموں کی فضا آفرینی، نغمگی، سلاست اور سوز وگداز سے متاثر ہے۔ حفیظ کی نظم ''ہمالہ'' اقبال کی نظم ''ہمالہ'' کی یاد دلاتی ہے۔ اسی طرح حفیظ کی نظم تاروں بھری رات میں اقبال کی نظم بزم انجم کا ایک حسین عکس نظر آتا ہے۔ حفیظ کی نظموں میں ہلال چاند، برسات، بہار میں وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں اقبال کی اس قبیل کی نظموں کا حسن اور دلاویزی سامنے آتی ہے۔

حفیظ جالندھری کا سب سے بڑا کارنامہ ''شاہنامۂ اسلام'' ہے۔ اس میں تاریخ

اسلام کے اہم واقعات اسلامی روایات کی عظمت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس نظم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامہ کے اسلامی تصورات کا نہ صرف مطالعہ کر چکے تھے بلکہ ان سے متاثر بھی تھے اور اسلام کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار اسی شد ومد اور جوش وسرگرمی کے ساتھ کیا ہے جس کی مثالیں کلام اقبال میں ملتی ہیں۔ کلام اقبال کا ایک حصہ بچوں کی شاعری سے متعلق بھی ہے جہاں اقبال بچوں کو حب وطن اور انسان دوستی کا سبق سکھاتے ہیں۔ اقبالؔ نے کئی کہانیوں کے منظوم ترجمے بھی کئے ہیں۔ ایک پہاڑ اور گلہری، ترانۂ ہندی، ایک مکڑا اور مکھی، بچے کی دُعا، ایک گائے اور بکری، ہمدردی اور اس طرح کی بہت سی نظمیں ہیں جن میں بچوں کا دل بہلاتے ہوئے بڑی بڑی باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ حفیظ کا ایک پورا مجموعہ کلام اقبال کے تتبع میں ''حفیظ کے گیت اور نظمیں'' اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان لفظوں میں کم وبیش انہی باتوں کا اعادہ ملتا ہے جو علامہ کے موضوعات ہیں۔

اگرچہ کلام حفیظ کی اپنی انفرادیت ہے اور وہ بڑے ہی خوبصورت استعاروں اور علامتوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی بحور اور سیدھے سادھے الفاظ کے استعمال پر قادر ہیں لیکن یہاں بھی وہ اپنے مرشد فن اقبالؔ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ نے جس زبان کا استعمال اپنی شاعری میں کیا، اس کا اثر ان کے معاصرین اور آئندہ آنے والی نسلوں پر بھی ہوا۔ حفیظ نے بھی ان اثرات کو قبول کیا ہے۔ کلام اقبالؔ کا ایک بڑا اثر حفیظ کی شاعری میں ملتا ہے۔ وہ اُن کے حسیاتی محاکات کا ہے۔ اقبال سے یہ سبق سیکھ کر انہوں نے اپنی علامتوں میں تمثیل کی تازہ کاری پیدا کی اور اپنی امیجری کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔

آنند نرائن ملا، اقبال سے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اقبال کے ساتھ ذہنی رشتہ ۱۹۲۷ء کے آس پاس قائم ہوا۔ ابتدا میں انہوں نے اقبال کے کچھ فارسی کلام کا انگریز میں ترجمہ کیا جسے کافی داد وتحسین حاصل ہوئی۔ اس کے بعد وہ اقبال سے برابر فیض حاصل کرتے رہے۔ ملا کا ابتدائی کلام، اقبال کی شاعری کی طرح قومیت اور وطنیت کے جذبات

کا آئینہ دار ہے۔ وہ بھی علامہ کے دور اولین کی شاعری کی طرح ہندوستان کے قدیم کلچر پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کی مشہور نظم زمینِ وطن اقبال کے ترانۂ ہندی کا عکس معلوم ہوتی ہے اور وہ بھی ہندوستان کے قدرتی مناظر کوہ و دریا اور جھرنوں اور جھیلوں پر اسی طرح فخر محسوس کرتے ہیں جیسا اقبال اپنی نظم میں کرتے ہیں۔ آگے چل کر موضوعات بھی کسی حد تک اقبال اور ملا کے کلام میں ایک عجیب مماثلت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں جذبے اور احساس کی ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے چنانچہ گورونانک، شاعر، شمع، انسان اور ارتقاء کے عنوانات سے دونوں شعراء کے یہاں نظمیں ملتی ہیں جن میں ایک ہی طرح کے خیالات کو مختلف پیرایہ اظہار میں پیش کیا گیا ہے۔ کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں ایک ہی رنگ نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملا اپنے کلام کو فلسفے کی ان باریکیوں سے سنوار نہیں سکے جو کلام اقبال کا ایک زبردست عنصر ہے۔ ملا غزل کے بھی شاعر ہیں اور غزل میں وہ روایتی پیکروں کو پیٹنے کے بجائے روایت سے انحراف کر کے ایک الگ راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ موجودہ معاشرے کے کرب کو اپنے لہجے کے مخصوص تیکھے پن سے ظاہر کرتے ہیں اور اپنے کلام کو محض ردیف وقافیہ کی قید تک پابند نہیں رکھتے۔ یہ نکتہ انہوں نے اقبال سے ہی سیکھا ہے۔ ملا کے اسلوب میں ایک عجیب نرمی وگھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ اقبال بڑے شاعر اس لئے ہیں کہ انہوں نے بڑے اور باریک موضوعات کو غزل کے رمز و کنایہ میں بیان کیا ہے۔ ملا نے بھی انہی نقوش پر چل کر اپنا مقام بنالیا ہے۔ علامہ کی غزل جو بظاہر موسیقی اور لے کا ایک خاص انداز لئے ہوئے ہے۔ ملا کے یہاں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور معنی کی نئی پرتیں کلام اقبال ہی کی طرح کھل جاتی ہیں۔ ملا اور اقبال کے خیالات کی ہم آہنگی ان مقامات پر واضح ہوجاتی ہے جہاں ملا کو جو چیز اقبال کے قریب اور ان کے اثرات کے ماتحت لے آتی ہے وہ ان کی غزلوں کی معنویت اور گہرائی ہے۔ ملا نے خالی خولی جذباتیت سے کام نہیں لیا ہے بلکہ کلام اقبال سے درس لے کر زندگی کے حقائق کو پیش کیا ہے اور اس طرح سے انسانی زندگی کی

پیچیدگیوں کا اظہار فنی قالب میں ڈھال کر کرتے ہیں۔ ملا کے یہاں زندگی کلچر اور سماج کے بارے میں جو نظریات نظر آتے ہیں وہ بہت حد تک کلام اقبال میں بھی نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اقبال کی روایات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہیں۔

اثر صہبائی اقبال کے ایک اور پیرو ہیں۔ اثر صہبائی نے آپ بیتی میں علامہ کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"علامہ اقبال کی شخصیت بالعموم اور ان کی غیر فانی شاعری بالخصوص میری زندگی اور شاعری پر اثر انداز رہی ہے۔"[1]

اثر صہبائی کی شاعری میں تصور عشق، تصور حسن، تصور حیات وغیرہ اقبال کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اثر بھی اقبال کی طرح عاشق ہیں اور حقیقت سے عشق کرتے ہیں۔ وہ بے کیف زندگی سے جنون عشق کو برتر سمجھتے ہیں اور عشق کو سرور جاوداں قرار دیتے ہیں۔ علامہ ہی کی طرح اثر عشق کے نشے میں بصیرت کی آنکھ کھولتے ہیں۔ اسی طرح اثر صہبائی کا تصور حسن اقبال کی تعلیمات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ کلام اقبال میں حسن کی کیفیات بکھری ہوئی ہیں۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ روح جمال سے آسودہ ہے۔ اثر صہبائی حسن کی حقیقت علامہ کی طرح ساری کائنات میں دیکھ لیتے ہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ حسن ہے۔ عاشق اسی نور کو تلاش کرتا ہے جو اس کا مرکز تمنا ہے۔ وہ اقبال ہی کی طرح نسوانی حسن اور دوسرے مظاہر جمال کو محض استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اثر کا تصورِ حسن، حسن مطلق کی تلاش ہے۔ یہ تلاش اقبال کے فکر کے مطالعے سے حاصل ہوئی ہے۔ حیات کے بارے میں اثر صہبائی کا نظریہ یہ ہے کہ مذہب کی روح حق جوئی، حق گوئی اور حق پرستی ہے۔ اقبال کے یہاں اس حق کی تلاش اسلامی تعلیمات کا بڑا فیضان ہے۔ اثر، اقبال ہی کی طرح درس عمل

---

۱) بہار الہ آبادی تفسیر اقبال، ص ۱۷۹

دیتے ہیں۔ وہ کبھی فرار میں پناہ نہیں لیتے۔ آثر نے تکنیکی اعتبار سے اقبال کی خوشہ چینی کی ہے اور اپنے خیالات کو تشبیہ اور استعارے کے ذریعے سے پیش کیا ہے جس طرح اقبال تشبیہ اور استعارے سے ایک نئی فضا تعمیر کرتے ہیں۔ آثر بھی اسی شاہراہ پر گامزن ہیں۔

جمیل مظہری ایک اور بلند مقام شاعر ہیں جن کے کلام میں بہت حد تک وہی فکری عناصر کارفرما ہیں جو کلام اقبال میں موجود ہیں۔ جمیل نے اقبال کے فلسفہ عمل کو اپنی شاعری کا بنیادی محور بنالیا ہے اور اُن کی بہت سی نظمیں اقبال کے اس فلسفے سے متاثر ہیں جن میں پیام، شاعر کی تمنا، آدم نو کا ترانہ، میں اور تو وغیرہ ذکر کے قابل ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، جمیل مظہری کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جمیل مظہری نے اقبال کے اس تصور کو بہت احتیاط سے اپنایا ہے اور اس میں وہی چیزیں لی ہیں جو ان کے نزدیک معتبر اور صحت مند ہے یعنی حرکت وحیات اور انسانی عظمت کو عمومی طور پر اپنا زاویہ نگاہ بنایا ہے۔'' (۱)

اقبال اور جمیل مظہری کے یہاں خدا کا تصور قدر مشترک ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ خدا کی شناخت خودی کی شناخت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اقبال اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ رکھتے ہیں۔ جمیل مظہری خدا سے متعلق مختلف تصورات اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خدا کا اسرائیلی تصور خدا کا آریائی تصور اور خدا کا اسلامی تصور موجود ہے جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تصورات تنگ نظری کے شکار نہیں ہیں۔ وہ تشکیک کے انداز میں ہر مسئلے کی طرح اس پر بھی غور کرتے ہیں۔ جمیل مظہری حرکت و عمل کے شاعر ہیں اور یہ فلسفہ اقبال نے بھی پیش کیا ہے۔ اقبال کے یہاں زندگی مسلسل حرکت کا نام ہے۔ اس میں تبدیلیاں رُونما ہوتی رہتی ہیں اور یہ ارتقاء پذیر ہے۔ علامہ کے نزدیک خودی کا انحصار ندرتِ فکروعمل پر ہے اور اس ندرت کو سوزِ آرزو سے حرکت ملتی ہے۔ جمیل بھی حرکت

(۱) خلیل الرحمٰن اعظمی: فکروفن، ص ۱۹۸

اور عمل کی اہمیت کے قائل ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اقبال مردِ مومن کو اخلاقی اقدار کا حامل بناتے ہیں اور جمیل انسان کو کسی بھی اخلاقی ضابطے سے وابستہ نہیں کرتے بلکہ عمل کو ہی ترجیح دیتے ہیں اقبالؔ اور جمیلؔ کے یہاں پیام، میں اور تُو وغیرہ مشترکہ عنوانات کی نظمیں ہیں۔ اقبال کا پیام عشق کی عظمت کا درس دیتا ہے اور جمیل ''پیام'' میں حرکت وحیات کے نظریئے کو پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ارتقاء کے عنوان سے دونوں کے یہاں نظمیں ملتی ہیں جو دونوں کے فلسفے پر دال ہیں۔ اقبالؔ کے نزدیک زندگی شعلہ مزاج ہے اور جمیل اس کے اثر سے انسان کو قدرت کا ایسا شاہکار ظاہر کرتے ہیں جو اپنی صلاحیتوں سے ترقی کرتا ہے۔

عورت کا تصور دونوں کے یہاں ملتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جمیل نے اقبال کے تصورات کی روشنی میں اپنا تصور قائم کیا ہے۔ اقبالؔ عورت سے عالم اور دانشور پیدا کرنے کی توقع کرتے ہیں۔ اور جمیل اس کو صابر اور ایثار و قربانی کا پیکر بناتے ہیں۔ عورت جمیلؔ کے نزدیک نہ روایتی ہے اور نہ جدت پسند نہ وہ اسے ملکوتی تقدس بخشتے ہیں اور نہ مغربی تہذیب سے آلودہ کرتے ہیں۔

عشق اور عقل کے تصور کے بارے میں بھی دونوں کے یہاں مماثلت ملتی ہے۔ جمیلؔ نے بھی اقبالؔ کے تتبع میں عقل پر عشق کو ترجیح دی ہے۔ لیکن وہ عقل کو عشق کے مقابلے میں بالکل رد نہیں کرتے۔ جمیلؔ مظہری عشق کو عقل پر فوقیت تو دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ عقل کے کردار کی اہمیت بھی تسلیم کرتے ہیں۔

فنی سطح پر بھی جمیلؔ مظہری، اقبالؔ سے گہرے طور پر متاثر ہیں۔ تشبیہ، استعارے، علایم اور تراکیب کی حد تک دونوں میں جو حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے وہ اسی اثر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ جمیلؔ نے اس میں کوئی شک نہیں فنی لحاظ سے بعض نئی روایات کا آغاز کیا اور مکمل طور سے قدیم باکمالوں کی تقلید نہیں کی۔ یہاں وہ علامہ اقبال کے بہت نزدیک آجاتے ہیں اور بار بار ایسی تراکیب استعمال کرتے ہیں جو اقبال کی متاعِ عزیز ہیں۔ جمیلؔ کے یہاں ذوقِ نگاہ، پیکرِ خاکی، ذوقِ نظر، درونِ خانہ، گردشِ ایام، نگاہ شوق، صبحِ ازل جیسی تراکیب بار

بار نظر آتی ہیں جو اقبال سے مستعار لی گئی ہیں۔ اس طرح دونوں کے یہاں سورج، آندھی، کرن، گھٹا، پربت، موتی، جیسے ہلکے پھلکے الفاظ مفاہیم کے خزانے پیش کرتے ہیں۔ جمیل مظہری نے اقبال کے کلام سے عشق، عقل، خدا، موت، زندگی، خودی، حسن، بے خودی، یقین، حیات، وغیرہ جیسے علایم بھی مستعار لیے ہیں اور اپنے تصورات کو رنگین کیا ہے۔

ماہر القادری بھی ایک اہم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیات میں پیکر تراشی اور علایم کی رنگارنگی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی خوبی بھی ہے۔ ماہر نے اردو کی جملہ شعری اصناف میں طبع آزمائی کی اور خاص طور پر نظم کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ذکر ہو چکا ہے کہ اقبال نے اپنے معاصرین اور اپنے بعد آنے والے شاعروں کو متاثر کیا۔ ماہر القادری کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہیں۔ ماہر القادری پر اقبال کے اثر کا سب سے بڑا محرک اقبال کا عشق رسول تھا۔ وہ اقبال کے اسلامی تفکر کے شیدائی بھی تھے اور اقبال کی جرأت اور بے باکی، سامراج دشمنی، غریب نوازی سے اکثر تحریک حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں عمل اور حرکت کا درس دیا ہے اور اکثر مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے۔ ماہر نے اپنے اشعار میں مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ ذاتی مفاد، ملی مفاد کے سامنے ہیچ ہے۔ اس لئے ملت کی بھلائی کے لئے ذات کو فنا کرنا عین سعادت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب خیالات اقبال کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ یہ کلام اقبال کا ہی اثر تھا کہ ماہر القادری نے بھی اسلام کے سرچشمے سے بصیرت پائی اور زندگی بھر اسلامی عقائد اور اسلامی تصورات کو شعر کے پیکر میں ڈھال کر پیش کرتے رہے۔ اتنا ہی نہیں ماہر القادری کی اکثر نظموں میں نظم اقبال کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اسلام اور اسلامی معاشرت سے دلچسپی لینے والے دوسرے شاعر اسد ملتانی ہیں جو اسلام اور مسلمان سے عشق کرتے تھے اور قرآن اور حدیث پر جان دیتے تھے۔ اسد ملتانی نے یہ ذہنی نہج اقبال کے سوز عشق سے حاصل کی تھی۔ اسد ملتانی کو اگرچہ اپنے زمانے میں بڑے بڑے شعراء کا ذہنی قرب حاصل رہا اور حالی کی سلاست اور سادگی نے انہیں اپنے

ریب کھینچا لیکن اقبآل کے تصورات نے ان کے مسلک کی تہذیب کی یہی وجہ ہے کہ
ہوں نے بار بار علامہ کو اپنا امام تصور کیا۔ اقبآل سے سوزِ عشق کا پیغام لے کر اسد ملتانی نے
ں کو عام کرنے کی کوشش کی ۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے اقبال کے رنگ و آہنگ
نوں کو قبول کرلیا۔ علامہ کے ساتھ ذہنی رشتہ اُستوار کرنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ
نوں کا مسلک اسلام تھا۔ اسد ملتانی کے کلام کا متعدد حصہ اقبآل کے ساتھ اس ذہنی رشتے
ا ثبوت ہے۔ ایسے مواقع جہاں وہ رسولِ اکرمؐ کی عطا کی ہوئی برکتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کلام
بآل کی طرح ایک سرمستی اور وارفتگی پیدا کرتا ہے۔ وہ خودنگری، خودی اور آئین سفا کیشی کو خودی
کے مترادف سمجھتے ہیں جو کلام اقبال کا بھی حاصل ہے۔ فنی لحاظ سے بھی اسد ملتانی کے یہاں
ی تشبیہات، ایسے علایم اور استعارے ملتے ہیں جو اقبآل کو بہت مرغوب تھے۔

ن۔م۔ راشد کی شاعری میں بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ، اقبال کی شعری شخصیت کا
لسل اور اس کی تشکیل نو ملتی ہے۔ اقبآل پہلے شاعر تھے جنہوں نے اپنے آپ کو قومی اور ملکی
اعری سے علیحدہ کر کے آفاقیت کے نقوش اُجاگر کیے۔ وہ مشرقی اور مغرب کی قدروں کے
صادم کو پیش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کی تہذیبوں میں واضح تضاد ہے۔ راشد کے
ہاں بھی یہ کرب ملتا ہے اور وہ مشرق کو مشرق کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔
بآل اور راشد کے نظریات میں کوئی مماثلت نہیں ملتی لیکن دونوں کا پس منظر چونکہ ایک ہی
ہد ہے لہٰذا اس عہد کی پیدا کی ہوئی بے اطمینانی کے خلاف دونوں کا ردعمل ایک جیسا
ہے۔ اقبآل نے جس طرح اپنے عہد کی سامراجی چالوں کو بے نقاب کیا تھا راشد نے بھی
شیا اور افریقہ میں ہونے والی سامراجی تباہ کاریوں کا نقشہ کھینچ کر اس کو بے نقاب کیا۔
امراج کے استحصالی نظام کے خلاف یہ ردعمل راشد نے اقبآل کے اثرات سے ہی حاصل
یا تھا لیکن اپنے اپنے ردعمل کو دونوں شعراء مختلف لہجوں سے پیش کرتے ہیں۔ راشد اس حد
ک اقبآل سے مختلف ہیں کہ وہ محض مادی بنیادوں پر مغربی تہذیب کو رد نہیں کرتے البتہ
شد کا نظریہ محض سیاسی ہے۔ راشد اور اقبآل کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ راشد

خالص طور پر نظم کے شاعر ہیں اور اقبال نظم اور غزل دونوں کے وسیلے سے بات کرتے ہیں۔ ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ راشد پابند نظم کے شاعر نہیں لیکن دونوں کے یہاں ایرانی اور عربی تلمیحات اور اساطیر کا واضح استعمال ملتا ہے۔ راشد نے یہ ہنر اقبال کے اثرات سے ہی حاصل کیا ہے کہ وہ بھی تلمیحات اور اساطیر سے نظم کی پوری فضا تعمیر کرتے ہیں۔

راشد، اقبال کے اثر سے الفاظ کے اسی ذخیرے سے کام لیتے ہیں جو کلاسیکی ہے اور اس میں وہ معنی کی نئی جہتیں پیدا کرتے ہیں یا حسب ضرورت نئی ترکیبیں اور استعارات گڑھ لیتے ہیں۔

احسان دانش ان شعراء میں سے ہیں جو اگرچہ مزدوروں اور محنت کشوں کی ترجمانی ساری زندگی کرتے رہے لیکن اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا سلیقہ انہوں نے اقبال سے لیا۔ اقبال پوری ملت کو حرکت اور عمل کی دعوت دیتے ہیں اور احسان یہی درس غریبوں اور مزدوروں کو دیتے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی چکی میں پسے ہوئے ہیں۔ احسان نے یہ اثر راست طور پر علامہ سے لیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اقبال کا سب سے اہم موضوع خودی اور خودشناسی ہے جسے انہوں نے وسیع تر تناظر میں پیش کیا ہے۔ احسان کے موضوعات اگرچہ نچلے طبقے کے لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر انہوں نے اپنی آتش نوائی سے یہ روح غریبوں اور مزدوروں میں پھونکی اور انہیں اپنے حقوق منوانے کے لئے جدوجہد پر اُکسایا۔ احسان دانش انہیں اپنی طاقت پہچاننے کی دعوت دیتے رہے۔ اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام کی ہمیشہ مخالفت کی اور اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ احسان دانش نے اگرچہ ذاتی تجربے کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظام کی چیرہ دستیوں کو سمجھ لیا تھا لیکن کلام اقبال کے مطالعے نے انہیں اظہار کو موثر بنانے کا راستہ سمجھا دیا۔

خیال اور موضوعات کی سطح پر بھی احسان نے علامہ سے شعوری طور پر اثر حاصل کیا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ انہوں نے اقبال ہی کی طرح شاعر، ایک آرزو، نماز، دنیا وغیرہ جیسی نظمیں لکھیں اور شام گورستان، میں اور تو، ایمان اور ترانہ جہاد جیسی نظموں میں

واضح طور پر اقبال کی تقلید کی۔

سردار جعفری، اقبال کے معترض بھی ہیں اور مداح بھی۔ سردار نے خود اعتراف کیا ہے کہ اقبال کی نظم ''خضر راہ'' نے سب سے پہلے انہیں بہت متاثر کیا۔ انہوں نے اپنے خوابوں کی دنیا تعمیر کرنا شروع کردی۔ بعد کے برسوں میں کلام اقبال کے اثرات ان کے یہاں برابر نظر آتے ہیں۔ سردار اور اقبال کے راستے جدا ہیں۔ سردار فارسی فلسفے کو اپنا جزو ایمان سمجھتے ہیں اور اقبال نے اسلام سے روشنی حاصل کی ہے لیکن حیات وکائنات کے مسائل، وطنی اور قومی تصورات، سامراج دشمنی اور اس طرح کے دوسرے تصورات سردار نے کلام اقبال سے لئے ہیں۔ سردار جعفری کی شاعری میں جو آہنگ اور جوش وخروش ملتا ہے، یہ اقبال کے ہی اثرات کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کہتے ہیں کہ ''اقبال کا آہنگ ہے آہنگ بغاوت''

سردار جعفری کے کلام میں اس دور کے انسان کا کرب نظر آتا ہے۔ وہ جنگ وجدل، فساد وانتشار کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ آواز اقبال کی بھی ہے اس لئے دونوں کا لہجہ ایک دوسرے سے مماثل نظر آتا ہے۔ سردار کے کلام کے ایک بڑے حصے میں کلاسیکی شاعری کا رچاؤ ملتا ہے اور یہ خصوصیت کافی حد تک اقبال کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اقبال نے ساقی نامہ جیسی مثنوی لکھی اور اس صنف میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ سردار اس نظم سے بہت متاثر رہے چنانچہ انہوں نے بھی جمہور کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی۔ فارم، ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے یہ مثنوی ساقی نامہ سے ملتی چلتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فنی اعتبار سے بھی وہ اقبال کے قریب ہیں۔

سردار جعفری کی غزلوں میں شکستِ شوق، تکمیل آرزو، خیال یار، داغ آرزو، آدم خاکی، خونِ جگر، کوچۂ قاتل، صبح بہاراں، شہر نگار، باغ جہاں، عروس قمر اور اس قبیل کی بیسیوں تراکیب استعمال ہوئی ہیں جو اگرچہ سب کی سب کلام اقبال سے مستعار نہیں ہیں لیکن ان میں سے بیشتر ایسی ہیں جن میں اقبال کے آہنگ اوران کے انداز کا اثر ملتا ہے۔

دورِ حاضر میں اقبال کے شیدائیوں میں جگن ناتھ آزاد کا نمایاں مقام ہے۔ اس کا ثبوت اقبال سے متعلق ان کی مختلف کتابیں ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اقبال اور اقبالیات کے بارے میں جس قدر تن دہی اور لگن سے انہوں نے کام کیا وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ آزاد ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ کلام اقبال سے عشق ہونے کے سبب سے ان سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ آزاد نے فکری اور فنی سطح پر اقبال سے استعفادہ کیا۔ انہوں نے اقبال کے آفاقی تصورات کو اپنے کلام میں رچالیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کے بیشتر موضوعات اقبال سے مماثلث رکھتے ہیں چنانچہ اس سلسلے میں ان کا تصور عشق قابل ذکر ہے۔ یہاں وہ اقبال ہی کی طرح عشق کو عشق کے تابع بناتے ہیں۔ اسی طرح تصور خودی، عمل اور حرکت کا تصور، حیات اور کائنات، سامراج دشمنی، وطنی شاعری ان سب موضوعات پر کلام اقبال کی چھاپ ہے۔ اس لئے خواجہ غلام السیدین کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ آزاد نے اقبال کے کلام سے انداز فکر اور انداز بیان لیا ہے۔ موضوع فکر کے سانچے اور زبان و بیان کی آب و تاب لی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے یہاں بھی فطرت کے مناظر کا جلوۂ صدرنگ نظر آتا ہے اور ان کا موئے قلم اقبال کی تصویری نظموں کا عکس کھینچتا ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اقبال کے اثرات کلام آزاد میں محسوس کئے جاسکتے ہیں چنانچہ ایسے علایم اور تراکیب مثلاً طائر گفتار، انوار قمر، سوز درون، عکس خورشید، راز ازل ، چشمۂ تماشہ وغیرہ ایسی ترکیبیں ہیں جو اقبال کے کلام میں بھی ملتی ہیں اور جن کو آزاد نے ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد اپنی انفرادیت رکھتے ہوئے بھی اس اثر سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتے ہیں جو اقبال کی دین ہے۔

شورش، اقبال کی نسل کے بعد کے شاعری ہیں اور اپنے معاصرین کی طرح انہوں نے بھی کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے فیض حاصل کیا ہے۔ دونوں کا منبع فیض اسلام اور اسلامیات ہے اس لئے دونوں کا ردعمل ایک دوسرے مماثل ہے۔ شورش، اقبال

کے علم وفضل اور اسلامی تفکر کے بڑے قائل تھے۔اس لئے انہوں نے اپنے تصورات کی تشکیل میں اقبال کی نظر اوران کے نظریات سے اثر لے لیا۔خاص طور پر عمل اورحرکت کے بارے میں اقبال نے جو درس مسلمانوں کو دیا ہے اسے شورش نے جذب کرلیا۔

متذکرہ بالا صفحات میں اقبال کے معاصرین اوراقبال کے بعد آنے والی نئی نسل کے بعض نمائندہ شعراء کا ذکر ہوا ہے اوران اثرات کا بھی ذکر کیا جاچکا ہے جو شعوری طور پران شعراء نے اقبال سے قبول کئے۔مدنظر رہے کہ اقبال کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے والے شعراء یا ان کے بعد آنے والے بعض شعراء اردو ادب میں ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اوران کا ایک مقام ہے۔یہ بھی صحیح ہے کہ اُن میں سے بعض لوگ اپنے علیحدہ رنگ سے پہچانے جاسکتے ہیں اورفنی حیثیت سے بھی انہوں نے اپنا لوہا منوایا ہے لیکن اسے کے باوجود وہ بعض تصورات کے لئے اقبال کے مرہون منت رہے ہیں اوران سے مستقل روشنی حاصل کرکے اپنی تخلیقات کا حصہ بنالیا ہے۔فنی لحاظ سے بھی اقبال کے انداز ان کے آہنگ اور زبان کے برتاؤ کے معاملے میں بھی ان سے استفادہ کرتے رہے اور یہ فطری بات ہے۔

کشمیر کا ایک اقبال شناس: اثر صہبائی

ریاست جموں وکشمیر میں وقتاً فوقتاً بعض ایسے مشاہیر ادب بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے قلم کی جولانی سے اُردو شعروادب میں نمایاں مقام پیدا کیا۔ ان مشاہیر ادب نے اپنی بیش بہا تخلیقات سے نہ صرف ریاست جموں وکشمیر کا نام روشن کیا بلکہ فرزندان کشمیر ہونے کا حق بھی ادا کیا۔ ان میں سے اقبالؔ (۱) چکبست، نسیمؔ، ہجرؔ، سرشارؔ، علامہ کیفیؔ، آغا حشر کاشمیریؔ، آنند نرائن ملا، سعادت حسن منٹو، رامانند ساگرؔ، قدرت اللہ شہاب، چراغ حسن حسرتؔ، اللہ رکھا ساغر، محمد عمر نورالٰہی، رفیق خاور، حبیب کیفوی، محمودؔ ہاشمی وغیرہ کے نام فخر کے ساتھ لئے جاسکتے ہیں۔ اثر صہبائی ایسے ہی مشاہیر ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

خواجہ عبدالسمیع پال نام، اثر تخلص، اثر صہبائی کے نام سے ادبی حلقوں میں مشہور ہوئے۔ ان کے اسلاف کسی زمانے میں وادیٔ کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ اثرؔ ۲۸ رد سمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ ہی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولوی احمد الدین پال جماعت اہلحدیث کے ایک فاضل بزرگ تھے۔ اثرؔ نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں پائی۔ ۱۹۱۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے اور ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ کچھ عرصہ

(۱) ان میں سے بعض حضرات ملک کے دوسرے حصوں میں پیدا ہوئے، لیکن ان کے آباء واجداد کشمیری تھے اور مختلف اوقات پر شدائد زمانہ سے تنگ آ کر سیلاب وآگ کی تباہ کاری سے متاثر ہو کر ہندوستان کے دوسرے حصوں میں آباد ہوئے۔

سیالکوٹ میں پریکٹس کرنے کے بعد جموں چلے گئے (۱) جہاں ۱۹۴۶ء میں سرکاری وکیل کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اس کے بعد جموں و کشمیر ہائی کورٹ میں اسسٹنٹ ایڈوکیٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر سے سیالکوٹ واپس آ گئے۔ یہاں اسسٹنٹ کسٹوڈین کے فرائض انجام دیتے رہے۔

اثر صہبائی جس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے، وہ زمانہ سارے ملک میں سیاسی ہنگاموں کا زمانہ تھا۔ چنانچہ خلافت، ہجرت اور عدم تعاون کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ گھر میں زبردست مذہبی ماحول تھا۔ جس نے زندگی کی صالح قدروں سے محبت کرنا سکھایا تھا۔ چنانچہ تعلیم کے دوران جب قومی سطح پر تحریکیں شروع ہوئیں تو آثر صہبائی بھی ان کے اثرات قبول کرتے رہے اور اکثر و بیشتر ان تحریکوں میں عملی طور پر حصہ لیتے رہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میرے کالج کے ایّام میں ہجرت، خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں زوروں پر تھیں۔ میں ایک ایسا حساس نوجوان تھا۔ جس کی زندگی کی عمارت شدید مذہبی جذبات پر اٹھائی گئی تھی۔ چنانچہ ان تحریکوں میں حصہ لیتا رہا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ تعلیمی اعتبار سے مجھے کچھ زیادہ خسارہ نہ ہوا۔" (۲)

آثر صہبائی کی خوشگوار ازدواجی زندگی بہت مختصر رہی۔ اُن کی بیوی راحت چار سال کی رفاقت کے بعد فوت ہو گئیں۔ جو ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ثابت ہوا اور جس نے اُن کی شاعری میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ اس کا ثبوت اُن کا مجموعۂ کلام "راحت کدہ" ہے جو بعض نقادوں کے مطابق شاہجہاں کے "تاج محل" (۳) سے کچھ کم نہیں ہے۔ آثر صہبائی نے ۲۶ رجون ۱۹۶۳ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

---

(۱) اثر مرحوم کے صاحبزادے سرمد صہبائی راقم السطور کے نام ایک تحریر میں لکھتے ہیں "میرے والد نے سرینگر میں محمد علی جناح کے ساتھ بطور اسسٹنٹ کام کیا تھا۔ میں نے جناح صاحب کا خط دیکھا تھا۔ جو میرے والد کے نام تھا جس میں انہوں نے میرے والد صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا۔

(۲) روحِ صہبائی (شعری مجموعہ) آثر صہبائی۔ ص ۳ اور ۴

(۳) اقبال (سہ ماہی) اکتوبر ۱۹۶۸ء، جلد ۱۷، شمارہ ۲، ص ۴۷

آثر صہبائی کوشعروشاعری کے ساتھ شروع سے ہی مناسبت تھی ۔ جب شعور کی عمر کو پہنچے تو اُردو شاعری میں اقبالؔ کے نغموں کی گونج تھی اور ٹیگورؔ کے دل نشین گیت جادو جگارہے تھے۔ پنجاب کے اہل علم حلقوں میں غالبؔ کی شاعری کو خاص طور پر پسند کیا جارہا تھا۔ اثر نے جب شاعری کا آغاز کیا تو ان اثرات سے دامن بچا نہ سکے۔ خود لکھتے ہیں:

> ''گیارہ بارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کی ابتدائی ہوئی۔ ان ایام میں غالب اور اقبالؔ کی شاعری پنجاب پر چھائی ہوئی تھی ۔ اُردو شاعری کا مطالعہ میں نے بھی انہی دو شاعروں کے کلام سے شروع کیا۔ ابھی سکول ہی میں تھا کہ ٹیگورؔ کی شہرہ آفاق تصنیف ''گیتانجلی'' کا اُردو ترجمہ بھی دیکھا۔ جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔'' (۱)

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر نے شاعری کا آغاز بہت ہی چھوٹی عمر سے کیا تھا۔ لاہور کے اسلامیہ کالج کی رنگین فضاؤں نے اس ذوق کو جلا بخشی ۔ وہ شروع سے ہی اقبالؔ کی شخصیت اور شاعری سے متاثر رہے۔ حافظ اور خیامؔ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ اسکے علاوہ شنکر آچاریہ، برگساں، بدھ، مہاویر، سری کرشن، حضرت عیسیٰؑ، سرورِ کائنات رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے بزرگانِ دین ہمیشہ ان کے لئے سرچشمۂ بصیرت رہے۔ اس کا اعتراف اپنی آپ بیتی میں یوں کرتے ہیں:

> ''علامہ اقبالؔ کی شخصیت بالعموم اور اُن کی غیر فانی شاعری بالخصوص میری زندگی اور شاعری پر اثر انداز رہی ہے۔ متقدمین میں حافظ مغفور اور خیام مغفور کے اثرات میری شاعری میں نمایاں ہیں۔ دُنیا کے فلسفہ میں ہنری برگساں اور شنکر آچاریہ مجھے خاص طور پر محبوب رہے ہیں۔ مذاہب کے

(۱) روح صہبائی از اثرؔ صہبائی ص ۳

بہت سے نکات قرآن کریم اور گیتا کے مطالعے سے حل ہوئے۔
سرورِ کائنات رسول عربیؐ میں مجھے انسان کامل ترین کی صورت
نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ گوتم بدھ، مہاویر، سری کرشن اور
حضرت عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء علیہم السلام سے ہمیشہ متاثر ہوتا
ہوں۔"(۱)

اس ضمن میں اُن کی کئی نظمیں، اشعار اور قطعات پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے ان بزرگانِ دین، مفکرین اور شعراء سے اثر صہبائی کی گہری عقیدت کا پتہ چلتا ہے، تیری وحدت کے گیت گاتا ہوں، دعا، نغمہ عقیدت بحضور حضرت عمر خیام نیشاپوری، کائنات اور انسان، شاعر سری کرشن، مہاتما گوتم بدھ، حضرت عیسیٰؑ اور سرورِ کائنات کے دربا میں اور نروان وغیرہ جیسی نظمیں اس سلسلے میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ چند نظموں کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

ساقی کوثر سلام! شافع محشر سلام
حُسن کے مظہر سلام ! عشق کے پیکر سلام
خلق کے رہبر سلام! ہادی اکبر سلام
اے شہِ خیرالوریٰ! اے شہ خیر الانام
تجھ پہ ہزاروں دُرود ! تجھ پہ ہزاروں سلام

(سلام۔ بحضور سرور کائناتؐ)

چھائی ہوئی باطل کی ہیں گھنگھور گھٹائیں
لبریز عفونت سے ہیں مسموم ہوائیں
تردید نے اُلفت کا گلا گھونٹ دیا ہے
باطل نے حقیقت کا گلا گھونٹ دیا ہے

(۱) سہ ماہی الزبیر (۷) آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ء ص ۳۱۸

کنس اور فلاطوس سے خونخوار ہیں لاکھوں
شہزادۂ ظلمت کے رضاکار ہیں لاکھوں
ہے پھیل چکی دامنِ عالم پہ سیاہی
ہرسُو نظر آتی ہے تباہی ہی تباہی
حق بیں بھی ہوں حق گو بھی حق کوش بھی ہوں میں
کچھ میکدۂ عشق کا مے نوش بھی ہوں میں

(شاعر۔سری کرشن مہاتما گوتم بندھ،حضرت عیسیٰ اور سرور کائنات کے دربار میں)

ہو جس کے ہر اک قطرے میں سرمستیٔ جاوید
میخانۂ ہستی میں وہ پیمانہ عطا کر
ہے سازِ طرب بیخودیٔ رقص طرب دے
بے شاہد وِ مے جرأت رندانہ عطا کر
بے ہوش ہیں جو چونک اٹھیں خوابِ گراں سے
ہنگامۂ آوازۂ مستانہ عطا کر
مٹی میں صنم خانہ باطل کو ملادوں
وہ گرزِ حق وہمتِ مردانہ عطا کر

(دعا)

شروع شروع میں آثر صہبائی اپنے بھائی امین حزین سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک مولانا تاجور نجیب آبادی کے تلمذ میں رہے۔ اُس زمانے میں پنڈت برجموہن وتاتریہ کیفی حکومتِ کشمیر کے اسسٹنٹ فارین سیکریٹری کے عہدے پر فائز تھے اور سردیوں میں کشمیر دربار کے ساتھ جموں منتقل ہوتے تھے۔ آثر صہبائی ان کے حلقے میں شامل ہوئے اور کافی عرصہ تک اُن کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ چند دنوں تک آثر لکھنوی کو بھی کلام دکھایا۔ اُس کے علاوہ ان کی خواہش یہ تھی کہ اُن کا کلام بڑے بڑے نقادانِ فن کی نظروں سے گذرا

۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے عالموں نے اُن کی تخلیقات کو پسند فرمایا۔ آثر صہبائی کو ان کی قیمتی آراء سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا۔ اور اُن میں اعتماد کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

''مولانا سلیمان ندوی نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور
مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما کر مجھ
میں یقین واعتماد کا جذبہ پیدا کردیا۔'' (۱)

اس کے علاوہ جموں کے دورِ قیام میں اثر صہبائی کو ڈاکٹر تاثیر، خلیفہ عبدالحکیم اور آثر لکھنوی جیسے دیدہ ور نقادانِ فن کے حلقے سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہوا جن کے دم سے کشمیر میں اُردو ادب کا ایک دبستان کھل گیا تھا۔ (۲) ان سب سے آثر صہبائی نے شعوری اور غیر شعوری طور پر اثرات قبول کئے اور سب سے بڑھ کر وہ اقبالؔ کے کلام کی سحر طرازی سے متاثر ہوئے اور فکر وفن میں اُن سے اکتساب فیض کیا۔ اس کا کھلا ثبوت اُن کی شاعری ہے۔

آثر صہبائی نے اپنی شاعری کا آغاز رباعیات اور قطعات سے کیا اور انہی دو اصناف تک اپنے آپ کو محدود رکھا۔ انہوں نے اس صنف میں اس قدر دسترس حاصل کی کہ وہ خیام العصر کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان اصناف میں انہوں نے حیاتِ انسانی کے مسائل اور فلسفیانہ نکات کو پیش کیا۔ اُن کی رباعیات کے دو مجموعے جام صہبائی (۱۹۲۸ء) اور جامِ طہور (۱۹۳۷ء) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور دنیائے ادب سے خراج حاصل کر چکے ہیں۔ بعد میں وہ غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے اور اس صنف میں بھی کمال دکھایا۔ انہوں نے نظم نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور اردو شاعری کو بڑی جاندار نظمیں دیں۔ ان کے بعض دوسرے مجموعے ''خمستان''، ''راحت کدہ''، ''روح صہبائی'' اور ''بامِ رفعت'' وغیرہ ہیں جن میں غزلیں، نظمیں، رباعیات اور قطعات ملتے ہیں۔

---

۱) روح صہبائی از آثر صہبائی، ص ۸

۲) سہ ماہی اقبال اکتوبر ۱۹۶۸ء، جلد ۱۷، شمارہ ۲، ص ۵۰

اثر صہبائی ایک فطری شاعر تھے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات کی فراوانی ہے لیکن خیال کی گہرائی کے ساتھ ساتھ وہ زبان کے برتاؤ سے بھی واقف تھے۔ اس لئے وہ طبع موزون کے تقاضوں کے مطابق مختلف اصنافِ سخن میں اظہارِ خیال کرتے تھے۔

اثر صہبائی قیام کشمیر کے دوران کشمیر کی تحریکِ آزادی سے بالواسطہ طور پر وابستہ رہے۔ اگرچہ برائے راست وہ عملی طور پر سیاست میں حصہ نہ لے سکے۔ لیکن ان کی تمام ہمدردیاں کشمیر کے مظلوم باشندوں کے ساتھ تھیں۔ اپنی بیشتر نظموں میں انہوں نے اس کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ اثر صہبائی نے ابتداء میں زیادہ توجہ منظر نگاری کی طرف کی۔ شروع کی نظموں میں قدرت کی رعنائیوں کی تصویر کشی بہت ہی خوبصورت انداز میں کرتے رہے۔ بعد کے برسوں میں قومی اور ملی مسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ قیام کشمیر میں اُن کی شاعرانہ حس زیادہ بیدار ہوئی تھی اور کشمیر کے ملکوتی حسن نے اُن کی شاعری کو جمال اور وقار بخشا۔ اثر صہبائی کے یہاں عشق و محبت کے رنگین جذبات بھی ملتے ہیں۔ جو اُن کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں۔ لیکن بعد میں جوں جوں ان کا شعور نکھرنے لگا ان کے یہاں فلسفیانہ مسائل سر اٹھانے لگے۔ اثر صہبائی کی شاعری کا آخری دور نعت گوئی پر ختم ہوتا ہے۔ انہوں نے نعتوں کے لکھنے کا سلسلہ ۱۹۵۶ء میں شروع کیا اور یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری لمحات تک برقرار رہا۔ اس سلسلہ میں ان کا مجموعہ بحضور سرور کائنات چھپ چکا ہے۔

علامہ اقبالؔ نے اپنی فکر، فلسفہ اور فن سے نہ صرف اپنے مابعد شاعروں کو متاثر کیا بلکہ اپنے معاصرین پر بھی زبردست اثرات ڈالے۔ اثرؔ صہبائی کے فکر و فن پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اقبالؔ کے خیالات سے فیض حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں شاعروں میں فکری اور فنی سطح پر گہری مماثلث پائی جاتی ہے۔ اثرؔ صہبائی نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں دوسرے اثرات کے ذکر کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؔ کی شاعری کے اثرات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

"علامہ اقبالؔ کی شخصیت بالعموم اوران کی غیر فانی شاعری بالخصوص میری زندگی اورشاعری پراثر انداز رہی ہے۔"(۱)

اقبالؔ کی شاعری میں عشق کی بڑی اہمیت ہے۔ عشق اقبالؔ کے مطابق حقیقت تک پہنچنے کا ایک طریقہ ہے۔ اقبالؔ عشق کے توسط سے دل کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں کہ عشق کی یہی آماجگاہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبالؔ نے عقل کے مقابلے میں کبھی عشق کا نہیں بلکہ دل کا نام لیا ہے۔(۲) اقبالؔ کے مطابق عشق ایک مشعل ہے یا بصیرت کا منبع ہے جس سے انسانی عمل راہ اور روشنی پاتا ہے۔ اسی ذوق عشق نے بڑے فنکار، بڑے عامل، بڑے قلندر اور سب سے بڑھ کر مردِ مومن پیدا کئے ہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں۔

عشق دمِ جبرئیل ، عشق دل مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اُس پر حرام
عشق تری انتہا عشق میری انتہا
تُو بھی ابھی نا تمام میں بھی ابھی ناتمام

اثر صہبائی بھی عاشق ہیں۔ عشق مجازی کی تپتی ہوئی پیاس نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اور وہ اپنی شاعری کے آخری دور میں حقیقت سے عشق کرنے لگتے ہیں اور اُن کلام عشق کی کرامات سے شعلہ زن نظر آتا ہے۔ عشق اُن کے لئے ذوق جستجو ہے۔ وہ بے کیف زندگی پر جنونِ عشق کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ عشق کو سرورِ جاوداں کہتے ہیں اور عشق کے راستے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ان کے لئے بے معنی ہیں۔ اثر صہبائی عشق کے نشہ میں ڈوب کر بصیرت کی آنکھیں کھولتے ہیں اور اسے ہجر کی تلخی اور وصل کے

(۱) تفسیر اقبالؔ از بہار اللہ آبادی ص ۱۷۹

(۲) تفسیر اقبالؔ از بہار اللہ آبادی ص ۱۷۹

کیف وسرور سے بلند تر چیز قرار دیتے ہیں۔ وہ اکثر اشعار میں عشق کے ساتھ زندگی گذارنے کا ذکر کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سودا نقصان کا سودا نہیں ہے۔ اس میں صلہ بھی ہے اور انعام بھی۔ یہ سب خیالات فکر اقبالؔ کے مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہوا ہے کہ اقبالؔ عشق کو ارفع درجہ دیتے ہیں اور اسے بصیرت کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ اسے سرور جاوداں سمجھتے ہیں۔ ان سب خیالات کو آثرؔ صہبائی نے اپنے تجربات کی سان پر چڑھا کر پیش کیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی دو رائیں نہیں کہ آثرؔ کے یہ خیالات فکر اقبال کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً۔

میرے لئے تو عشق ہے ایک سرورِ جاوداں
میں نہ کبھی سمجھ سکا جور ہے کیا ستم ہے کیا

بے کیف زندگی سے ہے بہتر جنونِ عشق
یہ بادہ تلخ تر ہی سہی ہائے وہُو تو ہے

عشق ہے اِک کیفیت ہجر ووصال سے بلند
اس کو نشاطِ وصل کیا، ہجر کا اس کو غم ہے کیا

عشق میں آتی ہے لذت زہرِ غم کھانے کے بعد
زندگی ملتی ہے یاں جاں سے گذر جانے کے بعد

سرشاریاں عجیب تھیں صہبائے عشق کی
کیا خوب بے نیاز تھے دونوں جہاں سے ہم

حسن کا تصور اکثر شعراء نے پیش کیا ہے۔ شروع شروع میں اقبالؔ حسن کے احساس کا اظہار کرنے لگے تو اُن کا رنگ سخن روایتی شاعری کے مانند تھا اور ان کا تصورِ حسن عام قسم کا تھا۔ لیکن جب اقبالؔ کی فکر و نظر بدل گئی تو تصورات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ وہ ہر چیز میں حسن دیکھنے لگے اور یہ وہ حسن تھا جس میں انہیں حسن مطلق نظر آنے لگا حتیٰ کہ اقبال کی شاعری کا دورِ دوم، دورِ حسن و جمال ہے۔ اقبالؔ کی طرح آثرؔ صہبائی بھی حسن کی حقیقت ساری کائنات میں دیکھ لیتے ہیں۔ ان کو حسن نہ صرف گل کی رنگینی میں نظر آتا ہے بلکہ کانٹے کی چبھن میں بھی ملتا ہے۔ چاند، تارے، پھول، شبنم، شباب غرض کہ کائنات کے ہر ذرّے میں حسن ہے۔ یہ شاعر کی چشم بینا ہے جس کے باعث گلستان کے ذرّے ذرّے میں، آسمانوں اور زمینوں میں حتیٰ کہ عشق کے داغوں میں بھی حسن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

آثرؔ صہبائی کا تصور حسن علامہ اقبال ہی کی طرح اُسی نور کی جستجو کرتا ہے جو اس کا مرکز

تمنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جمال کا پرتو بھی۔ وہ بھی چاند اور ستاروں اور کائنات کی ان گنت حسین اشیاء کو دیکھتا ہوا اپنے محبوب کے پاس پہنچنا چاہتا ہے، جو دراصل حسن مطلق ہے۔ اس لئے نسوانی جمال اور دوسرے مظاہر جمال کو وہ محض استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آثر صہبائی نے یہ تکنیک علامہ سے سیکھی ہے اور انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت ذیل کے اشعار سے ہوتی ہے۔

مے حسن کی پیتا ہوں خمخانۂ ہستی سے
سب مجھ کو سمجھتے ہیں مے کش میری ہستی سے
اُس مست کو صہبائی ہم مست سمجھتے ہیں
حاصل نہ کرے مستی جو بادہ پرستی سے

⊙

گلزار کا پھول، پھول پیمانۂ حسن
اشجار کی شاخ شاخ مستانۂ حسن
دوشیزۂ صبح ہے صبحِ بردوش
ہنگامۂ سحر چمن ہے مے خانۂ حسن

⊙

اے کاش فروغِ نور ہوجائے دل
تاریک ہے برق طور ہوجائے دل
یا حسنِ ازل کا آئینہ ہوجائے
یا ٹوٹ کے چور چور ہوجائے دل

⊙

مسکراتا ہوا جب کوئی حسین آتا ہے
اے خدا پھر تری ہستی کا یقین آتا ہے

حسن ہی حسن جلوہ فرما ہے
آسمانوں میں اور زمینوں میں

⊙

اشعار بالا سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ آثر صہبائی کا تصورِ حُسن مطلق کی تلاش میں ہے اور اسی حسن مطلق کا پرتو شاعر کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے۔ یہاں کسی جگہ پر بھی جسمانی حسن کا تصور نظر نہیں آتا اور نہ ہی سستی حسن پرستی کا، جو روایتی حسن پرستی کا طرۂ امتیاز رہا ہے تصورِ حسن کی یہ لَے اقبال کے اشعار سے نئے انداز میں پھوٹتی ہے اور اثر صہبائی اس سے یقیناً متاثر ہوئے ہیں۔

علامہ اقبال کی طرح اثر صہبائی نے بھی حیات کو ایک مخصوص نظر سے دیکھا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ مذہب میری زندگی اور شاعری کا اہم ترین عنصر بن چکا ہے۔ میرے نزدیک مذہب کی روح حق جوئی، حق گوئی اور حق پرستی ہے۔ اس اعتبار سے میں جملہ علوم وفنون پر مذہب کو حاوی اور محیط سمجھتا ہوں۔ یوں بھی مذہب انسان کے بلند ترین افکار، پاکیزہ ترین جذبات اور لطیف ترین احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ (۱) اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مختلف مسائل کو ایک مخصوص نظریئے سے دیکھتے ہیں۔ ایسے مسائل میں حیات کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ اسلام کا سرچشمۂ فکر اسلامی تعلیمات ہیں۔ اور اسلام اور قرآن کی روشنی میں انہوں نے مختلف مسائل پر جن میں حیات بھی ایک ہے، سوچا ہے، اثر صہبائی کی شاعری اس اثر سے الگ نہیں ہے۔ وہ اقبال ہی کی طرح زندگی کو ایک ایسی آگ سمجھتے ہیں جو ساری زندگی انسانی وجود کے اندر سلگتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ زندگی میں پیش آنے والے مصائب سے بھی نہیں ڈرتے۔ بلکہ اقبال کی طرح درس عمل دیتے ہیں۔ آثر صہبائی رجائیت میں یقین رکھتے ہیں اور وہ کسی بھی مشکل میں گرفتار ہوکر فرار کا عمل اختیار نہیں کرتے کہ فراریت اور رہبانیت اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اقبال نے بھی اسی لئے

(۱) روحِ صہبائی (شعری مجموعہ) از اثر صہبائی، ص ۷

سے اپنے نغموں کو چھیڑا تھا۔ آثر صہبائی کے خیالات کو سمجھنے کے لئے ان کی نظم "اسرار حیات" سے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

سطحِ دریا پر اُبھر آتے ہیں ہم — بُلبلے ہیں تیرتے جاتے ہیں ہم
تیر کر لیکن ذرا کچھ دور تک — اس نئی ہستی سے گھبراتے ہیں ہم
تنگ آکر وحشتِ انکار سے — سر انہیں موجوں سے ٹکراتے ہیں ہم
ٹوٹ کر دریا میں ہو جاتے ہیں غرق — پھر سکونِ بے خودی پاتے ہیں ہم
خوب ہے نیرنگیٔ موت وحیات — بس یونہی بن بن کے مٹ جاتے ہیں ہم
کیا وہیں تھے ہم جہاں ہیں اے آثر — یا کہیں جاتے ہیں یا آتے ہیں ہم

اس نظم کے علاوہ چند شعر ملاحظہ فرمائیے جن سے آثر صہبائی کے نظریۂ حیات پر روشنی پڑتی ہے۔

ہے بزمِ حیات کی نہ پروا مجھ کو — ہے ظلمتِ موت کا نہ کھٹکا مجھ کو
ہر شام ہے خوابِ مرگ طاری مجھ پر — ہر صبح ہے اک حیاتِ تازہ مجھ کو

ناکامیٔ زندگی سے ڈرنا کیا — ہنگامِ شکست آہ بھرنا کیا ؟
زندہ ہے اگر تو تنگ ہستی کیوں ہے — یہ موت سے پیشتر ہی مرنا کیا؟

نیرنگ طلسمِ زندگی کو پایا — آلودۂ غم ہر اک خوشی کو پایا
تسکین ہے اگر تو ذکرِ یزداں میں آثر — سرچشمۂ بے خودی اسی کو پایا

زندگی سوز ہے ! کہ تا دمِ زیست — ختم یہ آہِ آتشیں نہ ہوئی

(۱) روحِ صہبائی (شعری مجموعہ) از آثر صہبائی، ص ۷

اقبالؔ اور اثرؔ صہبائی کئی اور میدانوں میں ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ اقبالؔ کے پاس سب سے بڑی دولت ذوق یقین کی دولت تھی۔ وہ اسے مرد کی شمشیر سمجھتے تھے۔ اسی طرح اُن کا خیال تھا کہ ذوقِ یقین مردِ مسلمان کے لئے ایک قندیل ہے جس سے ظلمت اور شر کی سیاہ راتوں میں اُجالا ہوسکتا ہے۔ اقبالؔ یہ سمجھتے تھے کہ بڑے عالم کے پاس ذوق یقین کی دولت نہ ہو تو اُس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ذوقِ یقین ایک ایسی چیز ہے جس کے سہارے سے غلامی کی زنجیریں کٹ سکتی ہیں۔ ذوق یقین پر اثر صہبائی کا بھی یقین تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ ذوقِ یقین ایک ایسی دولت ہے جس سے وہ عظمت حاصل ہوتی ہے جو رشک ذوعالم ہو۔ اثرؔ نے اپنے اشعار میں اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ ذوقِ یقین ہی ہے جو انسان کی روح ہے دراصل ذوقِ یقین کی جستجو اثرؔ صہبائی کے اشعار میں ایک تڑپ پیدا کرتی ہے۔ یہ اگر اقبالؔ کے لفظوں میں خمیرِ حیات کو پرُسوز بناتی ہے تو اثرؔ صہبائی کے لفظوں میں یہ ذوق خاتم ہستی کا نگینہ ہے۔ ذوقِ یقین کا یہ سوز دونوں شعراء کو تڑپا تا رہا ہے اور اُن کی شاعری میں ایک بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں ؎

مئے یقین سے خمیر حیات ہے پرُسوز
نصیب مدرسہ یارب یہ آبِ آتشناک

یقین محکم ، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

گماں آباد ہستی میں یقین مرد مسلمان کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیل رہبانی

اور اثرؔ صہبائی کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیے۔

درماندہ وگم گشتہ وآشفتہ نظر ہوں
ہوں گرم سفر پھر بھی کہ مجبور سفر ہوں
مجروح دل وجاں ہیں کہ مجروح یقین ہے
مل جائے اگر ''ذوق یقیں'' کی مجھے دولت

پھر اشک دو عالم ہے مری رفعت وعظمت
یہ ذوقِ یقیں خاتمِ ہستی کا نگیں ہے

(ذوق یقین)

اسی طرح انسان کا تصور دونوں کے یہاں مماثل ہے۔اقبالؔ کے نزدیک اس کائنات کا مقصودکل انسان ہے۔اس لئے بلند اور بالا اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف ذاتِ خداوندی ہے۔اس لئے انسانی زندگی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔اقبالؔ نے اپنی نظم ''فرشتے آدم کی جنت سے رخصت کرتے ہوئے'' اور ''روحِ ارضی'' میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔فرشتے جب آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں تو وہ اس سے کہتے ہیں کہ اگر چہ تمہاری تقدیر میں روز وشب کی بے تابی ہے لیکن تمہیں اپنی بھی خبر نہیں۔تمہارے خمیر میں چانداور ستاروں کی بے قراری بھری ہوئی ہے اور تم اتنے حسین ہو کہ خواب میں بھی اپنے حسن کو دیکھ کر جھوم اُٹھتے۔تمہاری نوا سے زندگی کا خمیر بے نقاب ہوتا ہے۔اسی لئے انسان کے اندر جو صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں،اُن کو دیکھ کر روحِ ارضی کھل اُٹھتی ہے اور جب وہ زمین کی طرف چلا جاتا ہے تو وہ اس کا استقبال کرتی ہے۔روح ارضی اسے بتاتی ہے کہ یہ ساری کائنات تمہاری منتظر ہے۔تمہارے آنے سے اُن کی قسمت جاگ اُٹھے گی۔اسی مقام پر اقبالؔ انسان کو خودی کا درس دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔

خورشید جہاں تاب کو ضو تیرے شرر میں — آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں — جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

اقبالؔ نے انسان کو بہت بلند درجہ دیا ہے جس کا سب سے بڑا جذبہ، جذبۂ عشق ہے اور جس کی بدولت وہ لافانی زندگی کا مالک بن جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دُنیا میں — انسان کی ہر قوت، سرگرمِ تقاضا ہے
اس ذرّہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہردم — یہ ذرّہ نہیں، شائد سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنساں کی — یہ ہستیٔ دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

(انسان)

روحِ انسانی کی اس بیکرانی اور وسعت کا اظہار اثرؔ صہبائی بھی کرتے ہیں۔ صہبائی کا خیال ہے کہ انسان کی روح سراسر راز ہے اور اب تک اس راز کو کوئی سمجھ نہیں پایا ہے۔ سائنس نے سمندر کی گہرائیوں کو ناپ لیا ہے۔ انسانی عقل آسمان کے اُس پار کی خبر لے آتی ہے۔ گردش ایّام کا معمہ انسانی عقل نے حل کیا ہے۔ لیکن انسان کیا ہے؟ وہ کس قدر بلند ہے؟ یہ آج تک کوئی سمجھ نہیں پایا ہے۔

اثرؔ صہبائی اقبالؔ کے اس خیال کے قریب آجاتے ہیں کہ انسان آسمانوں سے برتر اور فرشتوں سے بلندتر ہے۔ چنانچہ ایک نظم ''روحِ انسان'' میں اپنے مؤثر انداز میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

پا سکو شائد سمندر کی بھی تم گہرائیاں — کر سکو طے عالم امکاں کی بھی پنہائیاں
گِن سکو شائد شعاعیں مہر عالمتاب کی — ڈھونڈ لو ممکن ہے راہیں انجم و مہتاب کی
کھول لو ممکن ہے گرہیں گردشِ ایّام کی — جان لو شاید حقیقت دورِ صبح و شام کی
پھول باغ آسماں سے چن سکو ممکن ہے یہ — نغمۂ ناہید بھی تم سن سکو ممکن ہے یہ
روح انسان ہے مگر وہ بحر ناپیدا کنار — جس کی تہ ناپید ہے جس کی ہیں موجیں بیشمار

فنی لحاظ سے بھی اقبالؔ اور آثرؔ کی شاعری میں مماثلت پائی جاتی ہے۔آثرؔ کی شاعری میں رنگارنگ تشبیہات اور خوبصورت علائم واستعارے پائے جاتے ہیں۔اس لحاظ سے بھی وہ اقبالؔ کے معاصرین میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔وہ بھی اقبالؔ کی طرح اپنے خیالات تشبیہات واستعارات کے ذریعے سے پیش کرتے ہیں کہ ایک انوکھی فضا تعمیر ہوتی ہے۔حسن وعشق کے جذبات ہوں یا فلسفیانہ افکار،فطرت کی سحر کاری ہو یا عشق ومحبت کا جذبہ،آثرؔ صہبائی نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں کی بازیافت میں رطب اللسان ہیں۔وہ اپنے خیالات کو انوکھے انداز میں پیش کرنے کے روادار ہیں۔ظاہر ہے کہ سوچنے سمجھنے اور خیالات کو اس طرح سے برتنے کا فن انہوں نے اپنے مرشدِفن اقبال سے ہی سیکھا ہے۔ کیونکہ اقبالؔ کی شاعری میں یہ اسلوب بہت نمایاں ہے۔آثرؔ کے ہاں بھی اقبالؔ کے معاصرین کی طرح بڑی معنی خیز تراکیب دیکھنے میں آتی ہیں۔ان تراکیب کے استعمال سے ان کی شاعری میں ایک نیا جذبہ جنم لیتا ہے اور اس طرح نئے نئے مفاہیم کے ساتھ نئی جہتیں ابھر کر سامنے آتی ہے۔آثرؔ نے اقبالؔ کی طرح بکھرے ہوئے الفاظ کو ایک دوسرے سے ملا کر ایک خاص رشتہ پیدا کیا ہے۔اس طرح سے اُنہوں نے اپنے ذہنِ رسا کے ذریعہ سے سوتے ہوئے لفظوں کو حرکت وحرارت دی ہے اور اس طرح سے وہ اپنے جذبات اور تجربات کو پڑھنے والوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اثر صہبائی،علامہ اقبال کی شخصیت اور فن سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔اسی لئے اُن کی شاعری میں اقبال کے اثرات بخوبی پہچانے جاسکتے ہیں۔

ماہنامہ شرازہ،سرینگر،شمارہ ۴،۵،جلد ۳۵

(نوٹ) میں اثر (مرحوم) کے صاحبزادو سرو صہبائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے والد مرحوم کی زندگی کے بارے میں ایسے بہت سارے واقعات مرحمت فرمائے جن سے میں نے بھر پور استفادہ کیا۔(پ۔ر)

پریم چند کا آرٹ

منشی پریم چند اردو اور ہندی افسانہ نگاری کے پیش رو ہیں۔ ان کا فن اس زمانے میں جوان ہوا جب جنگ عظیم شباب پر تھی۔ اور دنیا کے بیشتر ممالک کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ پریم چند کے ادب نے آگ کی چنگاریوں میں جنم لیا تو بے جا نہیں ہوگا۔ یہی چنگاریاں آگے چل کر شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ منشی پریم چند نے اپنا ادبی سفر ایک رومان نگار کی حیثیت سے شروع کیا۔ وہ ابتداء میں راجپوتوں کی راست بازی، ویدک ہندو تہذیب، آریہ دھرم اور اس طرح کے دوسرے موضوعات پر قلم چلاتے رہے۔ چنانچہ پریم پچیسی، خوب وخیال، خاک پروانہ وغیرہ میں قبیل کی کہانیاں ملتی ہیں۔ جو زندگی کے حقیقی مسائل کے بجائے عشق و عاشقی کے راگ الاپتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ رومان کی سرحدوں سے نکل کر حقیقی دنیا میں آ گئے اور اپنی خداداد صلاحیت سے اردو افسانے کی تاریخ میں انفرادی مقام متعین کیا۔ وہ بنیادی طور پر اپنی لافانی تحریروں سے ظلم وتشدد کا قلع قمع کرنے لاچار اور بے بس عوام کے پامال حقوق بحال کرنے، سامراجی اور جاگیردارانہ نظام کے جور واستبداد کے خلاف آواز بلند کرنے کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے انوکھے انداز سے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں ان تمام چیزوں کی تصویر کشی کی ہے۔

منشی پریم چند کا خاندانی نام دھنپت رائے ہے۔ ان کے والد منشی عجائب لال متوسط

طبقہ کے ایک فرد تھے۔ وہ محکمہ ڈاک میں پچیس روپیے ماہوار تنخواہ پر کلرک تھے۔ انہوں نے دھنپت رائے کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ انہیں اپنے تمام خوابوں کی تعبیریں اپنے اسی بچے میں نظر آنے لگی تھیں۔ پریم چند کے تایا انہیں نواب کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی لئے منشی جی کی ابتدائی تحریریں نواب رائے کے نام سے ملتی ہیں۔ منشی پریم چند کی ولادت بنارس کے ایک دور دراز دیہات لمہی پانڈے پور بنارس میں ۳۱ رجولائی ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دیہات میں ہی حاصل کی۔ ۱۸۹۸ء میں سکینڈ ڈویژن میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق اس قدر دامن گیر تھا کہ افلاس اور ناداری کے باوجود بھی انہوں نے ۱۹۱۹ء میں بی۔ اے بطور پرائیویٹ اُمیدوار کامیاب کیا۔ اس طرح سے ان کا ذہن اور بھی کشادہ ہو گیا اور وہ نئے طرز عمل سے سوچنے لگے۔ دھنپت رائے ابھی صرف آٹھ سال کے تھے کہ ان کی والدہ سورگباش ہو گئیں۔ اس طرح سے وہ بچپن میں ہی ماں کی ممتا سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ پریم چند کے والد نے کچھ عرصہ کے بعد دوسری شادی رچائی لیکن پریم چند سوتیلی ماں سے اپنی حقیقی والدہ کا پیار نہ پا سکے۔ ان کی کئی کہانیوں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ابھی یہ گھاؤ مکمل طور پر مندمل بھی نہ ہوا تھا کہ ان کے والد چند ماہ کی علالت کے بعد انتقال کر گئے اور گھر گرہستی کا سارا بوجھ منشی جی کے نازک کندھوں پر آن پڑا۔ اس طرح سے انہیں زندگی کو سمجھنے اور حقائق کو جھیلنے کا خوب موقعہ میسر ہوا۔ پریم چند جب پندرہ برس کے ہوئے تو ان کی شادی رچائی گئی۔ ان کی گھریلو ذمہ داریوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے ملازمت کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے۔ آخر ایک اسکول میں اٹھارہ روپے ماہوار تنخواہ پر اسسٹنٹ ماسٹر مقرر ہوئے بعد میں انسپکٹر آف سکولز بنائے گئے۔ پریم چند کی ازدواجی زندگی ناخوشگوار رہی۔ اپنی سوتیلی ماں اور بیوی کے روز کے جھگڑوں سے ان کا دل اُوب گیا تھا۔ وہ خود شریف النفس تھے اور ان ہنگاموں سے دور رہنا چاہتے تھے۔ ابھی اپنے گھر کے حالات سدھارنے ہی لگے تھے کہ ان کی بیوی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ کافی انتظار کرنے کے بعد انہوں

نے ایک بال ودھوا شریمتی شیورانی کے ساتھ دوسری شادی رچائی۔ یہ شادی بڑی سود مند ثابت ہوئی شیورانی جی کے آنے سے پریم چند کے گھر میں ایک نئی بہار آئی اور ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا لیکن تنگ دستی اور ناداری شاملِ حال رہی۔ ملازمت کے دوران انہیں بہت سے پاپڑ بیلنا پڑے۔ کبھی حکومتِ زمانہ کے خلاف لکھنے کی پاداش میں انہیں دور دراز علاقوں میں تبدیل کر دیا گیا اور کبھی نا قابل افسروں کا پول کھولنے پر ان کی طلبی ہوئی۔ کبھی وہ مختلف سازشوں کا شکار ہوئے اور کبھی حکومت کو اُن کی کہانیوں میں باغیانہ خیالات نظر آنے لگے۔ حتیٰ کہ جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تو اس کی اشاعت سے انگریزی سرکار لرزہ براندام ہوگئی اور اس کے تمام نسخے ضبط کر کے نذر آتش کر دیئے گئے۔ یہ مجموعہ پریم چند کی خداداد صلاحیت کا پتہ دیتا ہے۔ چنانچہ سوزِ وطن، کے شائع ہونے کے فوراً بعد انہیں انگریزی حاکموں نے طلب کیا اور کہا کہ

> ''تمہاری کہانیوں میں سڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو جاؤ کہ انگریزی عملداری میں ہو۔ اگر مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے۔ تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے۔''

لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ وہ ہر وقت سماج کے رستے ہوئے ناسور کو کاغذ پر انڈیلتے رہے اور حکومت زمانہ کے جور و استبداد کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ چنانچہ جب انہیں ملازمت سے برطرفی کا خطرہ لاحق ہوا تو انہوں نے اپنے عزیز دوست دیا نرائن نگم کے کہنے پر دھنپت رائے کے بدلے اپنا قلمی نام پریم چند اختیار کیا اور ۱۹۱۰ء میں زمانہ کانپور کے دسمبر کے شمارے میں پریم چند کے نام سے ان کی پہلی کہانی 'بڑے گھر کی بیٹی' شائع ہوئی۔ وہ پیشم اور بمبوق کے قلمی ناموں سے بھی کافی عرصہ تک لکھتے رہے۔ پریم چند کا بنیادی مقصد غفلت میں سونے والوں کو بیدار کرنا تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں پر ڈھائے گئے

ظلم وستم برداشت نہ کرسکتے تھے۔ انگریزوں نے اس ملک میں جو آگ لگائی تھی، پریم چند ہر قدم پر اپنی تحریروں سے اس کا رخ پلٹنا چاہتے تھے اور ملک وقوم کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے ان کی تحریروں میں ہندوستان کی جدو جہد آزادی کی تصویر کشی ملتی ہے۔ جون ۱۹۳۰ء کو بناری داس چترویدی کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''میری تمنا بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو بھی یہی ہے کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ کی تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہو...... میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ سے دھیان ہے۔''(۱)

پریم چند تحریک آزادی کے اُبال کی پیداوار ہیں۔ وہ ملک اور عوام کو آزاد فضاؤں میں سانس لینے کے متمنی تھے۔ انہیں حکام نوازی اور انگریز پرستی سے شدید نفرت تھی۔ انہوں نے اس وقت کے ہندوستان کی بھوکی اور ننگی تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے جس پر ایک بیرونی سامراج حکمرانی کر رہا تھا اور جس نے ہمارے ملک میں لوٹ کھسوٹ مچائی ہے اور ظلم وتشدد اور بربریت کا بازار گرم کیا ہے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ پریم چند خود دیہات کے نچلے طبقے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنا بچپن اور جوانی انتہائی افلاس اور ناداری کی حالت میں گزاری تھی۔ اسی لئے وہ ہندوستان کے دیہی مسائل سے واقف تھے۔ انہوں نے اپنی اکثر کہانیوں کے موضوعات دیہاتوں سے لئے۔ وہ پہلے ہندوستانی فن کار تھے جن کے یہاں ہندوستان میں رہنے والے عام انسان کے احساس بغاوت کے ساتھ ساتھ محنت کش عوام کے ساتھ گہری ہمدردی

(۱) بحوالہ شیرازہ، سرینگر۔ پریم چند نمبر جلد ۲۰: شمارہ ۳۱ رجنوری ۱۹۸۱ء

ملتی ہے۔ انہوں نے اس دھرتی کی کہانیاں لکھیں اوران انسانوں کی اپنی کہانیوں میں مرکزتوجہ بنایا جو محنت کش طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پریم چند دیہاتی مسائل سے بخوبی واقف تھے۔اپنی کہانیوں میں انہوں نے دیہاتوں سے ہی خام مواد حاصل کیا۔ چنانچہ دیہات کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی ان کے افلاس اورناداری اوران پر ہورہے ظلم وستم کو پریم چند نے اس طرح دردناک پیرائے میں بیان کیا ہے کہ دل بھرآتا ہے۔ پریم چند صحیح معنوں میں ایک مصور تھے۔ان کے یہاں سب سے پہلے ارضیت کے پہلو نظر آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک سچے فن کار کی طرح لوگوں کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں اور پھر اس کو کھل کر بیان کرنے کے قائل ہیں۔ایک حقیقی فنکار کی یہی پہچان ہے۔

منشی پریم چند نے اپنی ادبی مسافت کا آغاز ۱۳سال کی عمر میں اپنے ادھیڑ مگر کنوارے ماموں کے عشق وعاشقی کا قصہ ایک ناٹک کی شکل میں لکھا۔ انہوں نے اپنا پہلا افسانہ ۱۸۰۷ء میں دنیا کا سب سے انمول رتن، لکھا جو زمانہ کانپور میں شائع ہوا۔ان کے ابتدائی دور کے افسانوں کی زبان پر سرشار اور ٹیگور کی گہری چھاپ ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان میں داستانی رنگ بھی نمایاں ہے۔ چنانچہ اس کی طرف خود ہی اپنے دوست دیانرائن نگم کے ایک خط میں اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”میرے طرز تحریر پر کسی دوسرے مصنف کے اسلوب بیان
> کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔لیکن پنڈت رتن ناتھ سرشار کا زیادہ
> اور ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا کچھ کچھ اثر انداز ہوا ہے“(۱)

اس کے بعد پریم چند نے بیسوں افسانے ناول، مضامین اور نثر پارے لکھے۔ یہ سارا دور ہندوستان میں افراتفری، بدامنی اور انتشار کا دور تھا۔ ہر طرف بغاوت کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی حالت ابتر تھی۔ عوام پر قسم قسم کے مظالم ڈھائے جارہے تھے۔ انگریزوں نے اس ملک کے نظام کو درہم برہم کردیا تھا۔ جاگیردارانہ نظام نے عوامی زندگی

۱) رسالہ زمانہ کانپور، پریم چند نمبر، ص ۱۰۷

کی جڑیں کھوکھلی کردی تھیں اور سارا ماحول تہس نہس ہو چکا تھا۔ ان تمام واقعات کے اثرات ایک حساس فنکار کے دل اور ذہن پر مرتسم ہونا گزیر تھے۔ پریم چند بھی ان اثرات سے دامن بچا نہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں ہندوستان کی معاشی، سیاسی اور طبقاتی کشمکش کا واضح نقشہ بڑے مؤثر انداز میں کھینچا ہے۔ معروف ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں میں ان کے عہد تک کے ہندوستان کی معاشی سیاسی طبقاتی اور عوامی کشمکش کا بڑا واضح اور تابناک نقشہ ملتا ہے۔" (۱)

پریم چند کے افسانے اردو افسانے کے ارتقاء کی منہ بولتی کہانی ہے۔ ان میں ادب اور سماج کو سمجھنے کی واضح کوشش ملتی ہے۔ یہ جیتے جاگتے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ ان کے مسائل ہیں ان کی خوشیاں اور غم ہیں۔ پریم چند کے افسانوں سے ہی ادب میں حقیقت نگاری کی بنیاد پڑتی ہے۔ ان کے یہاں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کی فریادیں ہیں۔ پریم چند کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے ایک عظیم فنکار کی طرح اپنے عہد میں ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف بغاوت کی اور پسماندہ طبقہ کی ترجمانی کی۔ انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے خطبہ صدارت میں خود کہا ہے:

"ہماری کسوٹی پر وہی ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

پریم چند بڑے حقیقت نگار تھے۔ انہوں نے اردو ادب میں مافوق الفطرت کی کوئی گنجائش نہیں رکھی بلکہ اس کے بجا ایسے حقائق پیش کئے جو عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی نظر

(۱) رسالہ زمانہ کانپور پریم چند نمبر، ص ۱۰۷

میں اتنی گہرائی اور بیان میں اتنی صداقت ہے کہ وہ تصور مجموعی حیثیت سے سارے ہندوستان کی ترجمانی کرسکتی ہے۔ پریم چند نے حقیقت نگاری کی جو بنیادیں قائم کیں، وہ بڑی صحت مند ہیں۔ ہر بڑا ادیب اپنے عہد کے انقلاب کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمانی ضرور کرتا ہے اور اس اعتبار سے پریم چند کی عظمت مسلمہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے انقلاب کے بنیادی سوال کو اپنے ادب کا مرکزی نقطہ بنایا اور وہ کسانوں کا سوال ہے، جسے انہوں نے فنکارانہ انداز سے پیش کیا۔

پریم چند کا ادب انسانی کرداروں کا روشن آئینہ ہے۔ ان کے یہاں نفسیاتی الجھنیں نہیں ملتی ہیں اور نہ جنسی اور اعصابی امراض کے شکار نوجوان، ان کے یہاں کچلے ہوئے انسان ہیں جو بہتر انسان بننے کے خواہش مند ہیں۔ پریم چند کی کہانیاں ہمیشہ سماجی مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ انہوں نے فرد کو کبھی سماج اور سماجی مسائل سے الگ نہیں کیا اور یہ ان کی حقیقت نگاری کا سب سے بڑا پہلو ہے۔ ان کے کرداروں کے دل میں اس سماجی نظام کے خلاف صدیوں کی تلخی اور نفرت بھری ہوئی ہے جس کی بنیاد ظلم، تشدد اور ناانصافی پر قائم ہے۔ یہ کردار کسان، کلرک، اچھوت اور درمیانی طبقے کے چھوٹے چھوٹے لوگ بھی ہیں اور زمیندار، ساہوکار، پولیس کارندے اور سرکاری افسر بھی، رشوت خوری بھی اور بے ایمان بھی، ظلم اور تشدد پھیلانے والے بھی اور مذہب کے نام پر لوٹ کھسوٹ کرنے والے بھی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند نے دیہاتی ماحول کی پوری پوری تصویر کشی کی ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں ہندوستان کی ہری بھری کھیتیاں، ہل چلاتے ہوئے بیل، بیج بوتے ہوئے کسان، خون پسینہ ایک کرتے ہوئے مزدور، غریبوں اور مظلوموں پر ظلم وستم ڈھاتے ہوئے جاگیردار رشوت لیتے ہوئے چنگی کے ملازم اور مہاجن وغیرہ ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند نے جس خوبی کے ساتھ ان مناظر اور کرداروں کو پیش کیا ہے۔ اس سے سارے ہندوستان کی زبوں حالی کی تصویر یہ ہمارے سامنے آتی ہے۔ پریم چند نے ہندوستانی عوام کو پہلی بار زبان دی ہے۔ یہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ تحریک

آزادی کو تیز تر کرنے میں ان کا حصہ بڑے بڑے رہنماؤں سے کچھ کم اہم نہیں۔انہوں
نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں آزادی کے جذبے کی ایماندارانہ عکاسی کی ہے۔مولانا
عبدالماجد دریا آبادی بجا طور پر لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں تحریک وطنیت کی تاریخ مؤرخ کا قلم
> جب آج سے سو پچاس برس کے بعد لکھے گا تو اس کے تیس
> پینتیس برس کی تاریخ کے لئے جہاں گاندھی، موتی لال، جواہر
> لال، ابوالکلام آزاد کی تقریریں اور تحریریں پڑھنے لازمی ہوں
> گی۔وہاں پریم چند کے افسانے بھی ناگزیر ہوں گے۔"

اس سلسلے میں ان کے بڑے بابو، بیٹی کا دھن، زنجیریں، ستی، کرموں کا پھل، نیچ
ذات کی لڑکی، جیسے افسانے اور جلوۂ ایثار، بیوہ، بازار حسن، میدان عمل اور گؤ دان وغیرہ
جیسے ناول پیش کئے جاسکتے ہیں۔پریم چند کی ان تخلیقات میں جو کشمکش اور تصادم ملتا ہے یہی
ان کے فن کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔

پریم چند نے ہندوستانی سوسائٹی کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ ہمارے سماج میں جو
نقائص ہیں، پریم چند نے ان پر بھی بے باکی سے انگلی دھری ہے۔یہاں ان کی خدمات
گاندھی جی کی خدمات سے کچھ کم نظر نہیں آتیں۔اس سماج میں جو کھوکھلا پن ہے۔اس کو اس
عظیم فنکار نے اپنے قلم کی توانائی اور فکر کی گہرائی سے ایک انوکھا رنگ بھر کے پیش کیا ہے۔
اس ضمن میں ان کی انتقام، بازیافت، بینک کا دیوالہ، تحریک حقیقت، دنیا کا سب سے انمول
رتن، فتح، کفن، یہی مرا وطن ہے وغیرہ جیسی کہانیاں پیش کی جاسکتی ہیں۔

حق بات تو یہ ہے کہ پریم چند نے اردو افسانے کو ارضیت کے ساتھ ساتھ وہ تازگی اور
توانائی عطا کی جہاں یہ عالمی کہانی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور
یہی کیا اہم ہے۔

پرواز ادب، پٹیالہ، نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء

کرشن چندر شخصیت اور فن

منشی پریم چند کے بعد جو قلم کار اردو کے مختصر افسانے کے اُفق پر نمودار ہوئے۔ان میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، دیویندر ستیارتھی، عزیز احمد، شوکت تھانوی، کشمیری لال ذاکر وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔افسانہ نگاروں کی اس کہکشاں میں کرشن چندر اپنا ایک ممتاز اور قابل قدر مقام رکھتے ہیں۔

کرشن چندر نے بے شمار افسانے، ناول اور ڈرامے لکھے۔اپنی تخلیقات میں انہوں نے ہر طبقہ کے لوگوں کی نمائندگی کی اور اپنے فن کو زندگی کے قریب لا کھڑا کر دیا۔وہ بڑے حقیقت نگار تھے اور زندگی کے حقائق پیش کرنے میں پیش پیش تھے۔

کرشن چندر ۲۳ر نومبر ۱۹۱۳ء کو بھرت پور (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ان کا آبائی وطن وزیر آباد (پاکستان) ہے۔ان کے والد گوری شنکر پیشے سے ایک ڈاکٹر تھے۔کرشن چندر کی ولادت کے پانچ سال کے بعد ۱۹۱۸ء میں ان کے والد کا تبادلہ جموں سے تقریباً تین سو کلومیٹر دور ضلع پونچھ میں ہوا۔پانچ سال کی عمر میں کرشن چندر کو ضلع پونچھ کے مینڈر پرائمری اسکول میں داخل کر لیا گیا۔انہوں نے وکٹوریہ جوبلی اسکول پونچھ سے ۱۹۲۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ لاہور چلے گئے۔جہاں سائنس کے مضامین کے ساتھ ۱۹۳۳ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۳۴ء میں کرشن چندر نے انگریزی ادب میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔اور ۱۹۳۷ء میں لاہور

کے لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اقبالؔ کی شاعری پر تحقیق کرنا چاہتے تھے مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

کرشن چندر شریف النفس، ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھے۔ وہ اعلیٰ جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی گھریلو زندگی بھی سادہ تھی۔ مہمان نوازی میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ انسانیت ان کا مذہب تھا۔ انہوں نے ہر وقت اپنے قلم سے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ اشتراکیت پر ایمان رکھتے تھے۔ کرشن چندر شروع سے ہی حب الوطنی کا جذبہ رکھتے تھے۔ اُن کے دل میں وطن دشمن عناصر کے خلاف آگ جل رہی تھی۔ اسی لئے وہ زمانۂ طالب علمی میں کالج سے بھاگ کر شہید بھگت سنگھ کے گروپ میں شامل ہوگئے تھے اور انقلاب کے نعرے بلند کرتے رہے۔ انہیں دو ماہ کے لئے لاہور کے قلعہ میں قید کر دیا گیا لیکن جب پولیس کوئی جرم ثابت نہ کرسکی تو انہیں باعزت رہا کر دیا گیا۔

کرشن چندر کا خاندان ہرا بھرا خاندان تھا۔ ان کے تین بھائی تھے۔ مہندر ناتھ، اوپندر ناتھ اور راجندر ناتھ۔ ان کا چھوٹا بھائی راجندر ناتھ بچپن میں ہی انتقال کر گیا تھا۔ کرشن چندر کے دوسرے بھائی اردو کے معروف کہانی کار مہندر ناتھ تھے۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ ناول نگاری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور نثر کی اس صنف میں بھی انہوں نے کافی نام کمایا۔ وہ ۲۰ مارچ ۱۹۷۴ء میں انتقال کر گئے۔ کرشن چندر کی اکلوتی بہن سرلا دیوی کہانیاں بھی لکھتیں تھیں۔ ان کی شادی ہندی کے معروف ادیب رتی شرن شرما سے ہوچکی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں کرشن چندر کی شادی لاہور میں شریمتی ودیاوتی سے رچائی گئی۔ ان کے تین بچے ہیں۔ جن کے نام رنجن کپیلا اور الکا ہیں۔ کرشن چندر کی ازدواجی زندگی ناخواشگوار رہی۔ انہوں نے اپنی پہلی بیوی شریمتی ودیاوتی کو طلاق دے کر ۱۹۶۱ء میں معروف خاتون افسانہ نگار سلمہ صدیقی سے دوسری شادی رچائی۔

کرشن چندر شروع سے ہی پڑھنے لکھنے کی طرف شغف رکھتے تھے۔ اسکول کے زمانے میں انہوں نے اپنے استاد ماسٹر بلاقی رام نندہ کے کردار سے متاثر ہوکر پروفیسر بلیکی

کے عنوان سے ایک طنزیہ افسانہ لکھا جو سردار دیوان سنگھ مفتون کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار ''ریاست'' دہلی میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ اس زمانے میں لوگوں نے بے حد پسند کیا اس افسانے میں انہوں نیا پنے استاد کا مذاق اُڑایا تھا جس پر اُن کے والد بہت خفا ہوگئے اس کے بعد کرشن چندر نے کافی عرصہ تک کچھ بھی نہ لکھا لیکن کالج کی تعلیم کے دوران ان کے اندر کا فن کار جاگ اٹھا اور انہیں پھر سے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ اس زمانے میں انہیں یرقان کی شکایت ہوئی، صحت یاب ہونے کے بعد انہوں نے اسی عنوان کے تحت ایک اور افسانہ لکھا جو ادبی دنیا لاہور میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔

کرشن چندر بعض انگریزی اور اردو رسائل سے بھی منسلک رہے اور ادارتی فرائض بھی بخوبی انجام دیتے رہے۔ انہوں نے 'نیا ادب' کے ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والا جرنل، 'نئے زاویے کی دو جلدیں بھی مرتب کیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کرشن چندر نومبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ ملازم ہوگئے۔ وہ دہلی اور لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشنوں میں بھی ملازمت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انہی دنوں ان کی ملاقات شالیمار پکچرز کے مالک اور نامور پروڈوسر ڈبلیو، زیڈ احمد سے ہوئی۔ وہ ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ انہی کی ایما پر کرشن چندر شالیمار پکچرز پونا میں ملازم ہوگئے جہاں ان کے سپرد کہانیاں اور منظر نامے لکھنے کا کام رکھا گیا۔ انہوں نے بے شمار فلمی کہانیاں اور منظر نامے لکھے۔ وہ بمبئی ٹاکیز اور نیشنل تھیٹر سے بھی وابستہ رہے اور ماڈرن تھیٹر کے نام سے اپنا ذاتی ادارہ قائم کیا۔ کرشن چندر اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ اپنے افسانوں اور ناولوں کی طرح انہوں نے اپنی فلمی کہانیوں اور منظر ناموں میں بھی نئے تجربے کئے۔ انہوں نے ادب کی طرح فلم کے میڈیم کی بھی بے لوث خدمت کی۔

کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ اگرچہ شروع میں انہوں نے انگریزی میں بھی متعدد مضامین لکھے جو معیاری رسائل واخبارات میں شائع ہوئے لیکن اصل میں وہ اردو افسانہ نگاری کے مرد میدان تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے

بعد جب انہوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا تو انکا پہلا افسانہ جہلم پر ناؤ میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ بہت ہی مقبول ہوا اور سب کی نگاہیں ان پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کے بعد کرشن چندر بے تکان لکھتے رہے ان کے ابتدائی افسانوں میں رومانیت کی گہری چھاپ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے افسانوں میں سیاست کی ہلکی ہلکی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔ ان افسانوں میں زندگی کے موڑ پر، گرجن کی ایک شام، نغمے کی موت، پرانے خدا، اور اَن داتا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اَن داتا، کرشن چندر کا ایک اہم اور لافانی افسانہ ہے۔ یہاں سے کرشن چندر کا ایک اہم موڑ شروع ہوتا ہے اسی افسانے سے انہوں نے سماجی حقیقت نگاری کی حدود میں قدم رکھا۔ یہ طویل مختصر افسانہ بنگال کے قحط پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور شاید سارے اردو ادب میں اس پایہ کی کہانی نہیں لکھی گئی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا سنہرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں انہوں نے بھارتیہ بحریہ کے جہازوں کی بغاوت سے متاثر ہو کر تین غنڈے اور ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہو کر پشاور ایکسپریس اور 'ہم وحشی ہیں' جیسے سدا بہار افسانے لکھے 'کالو بھنگی' اور مہا لکشمی کا پل، بھی کرشن چندر کے قابل قدر افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں سرمایہ دارانہ، نظام اور محنت کش طبقہ کے درمیان کشمکش ملتی ہے ان کے علاوہ کرشن چندر کے بیسیوں افسانے ہیں جن میں زندگی کے حقائق کو بڑے نرالے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسے افسانوں میں گھونگھٹ میں گوری جلے، لکڑی کے کھوکھے جنت اور جہنم، پورے چاند کی رات، سب سے بڑا گناہ، اجنتا سے آگے، کالا سورج، ٹوٹے ہوئے تار، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چند افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں عشق و محبت کی سرمستی بھی ہے اور ظلم و تشدد کے واقعات بھی فلسفہ حیات بھی ہے اور انسان دوستی اور امن پرستی کا جذبہ بھی۔ طبقاتی جدوجہد بھی ہے اور مناظر قدرت کی رنگارنگی بھی۔ مثلاً

"بعض سیدھے سادے لوگ خیال کرتے ہیں کہ کپڑے انسان کی خوبصورتی کو بڑھاتے ہیں۔ یہاں میں وہ دہرانا نہیں چاہتا جس کا مطلب ہے کہ چاند گہنوں کے بغیر

بھلا معلوم ہوتا ہے مگر میں یہ بات ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان سیدھے سادے لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے۔ کپڑے دراصل اسی لئے پہنے جاتے ہیں کہ لوگ اپنی بدصورتی کو چھپا سکیں جس طرح روحانی بدصورتی کو لوگ خیرات سے ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح جسمانی بدصورتی کو چھپانے کے لئے خوشنما پوشاکیں پہنی جاتی ہیں...... گلاب کی کلی ،چنبیلی کا پھول، آسمان کی نیلاہٹ، شفق کا حسن، اگر ان تمام چیزوں کو کپڑوں کی ضرورت نہیں تو کیا صرف انسانی حسن کو کپڑوں کی حاجت ہے۔'' (ننگے زینے پر)

ندی کے کنارے سے آنگی کسی بے فکر ہرنی کی طرح قدم رکھی ہوئی آ رہی تھی۔ کاندھے پر پتلی سی سونٹی تھی، لبوں پر ایک بے معنی سا گیت، پاؤں ننگے تھے، لیکن چال پر ایک خاموش موسیقت کا شبہ ہوتا تھا۔ مسافر نے اپنی کتاب بند کردی اور آنگی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ کاش وہ مصور ہوتا کتنی خوبصورت تصویر ہے، کتنا دلکش پس منظر؟ آنگی کے سڈول مگر مضبوط بازو، اس کی کمر کا متناسب خم، اچھا تو وہ سنگتراس ہی ہوتا۔ دنیا میں کسی کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں۔ ورنہ وہ مجسمہ تیار کرتا کہ یونانی صنم گر بھی ششدرر رہ جاتے۔'' (آنگی)

''پارٹی بڑی شاندار تھی۔ راجہ صاحب لاگرا اور نواب آف گھاگھرا، بیگم داوری اور رانی صاحبہ گاودی، کرنل گھوڑے والا اور مسز چھتری والا، پیر صاحب بوڑھا اور مہنت صاحب توڑھا۔'' (لکڑی کے کھوکھے)

میں آرٹسٹ نما لونڈے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ پھر میں نے اسے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا تو جواب میں اس نے پھر مجھے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ اس کے بعد میں نے پھر اسے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنا چاہا کہ لاری ایک گڈھے سے گزری اور گویا بھونچال سے گزر گئی۔ (اجنتا سے آگے)

کرشن چندر نے اپنا بچپن پونچھ کی وادیوں میں بسر کیا۔ اس لئے ان کی اکثر یادیں پونچھ سے وابستہ ہیں۔ ابتداء میں انہوں نے اسی وادی کے حسن کی کہانیاں لکھیں لیکن انہیں جلد ہی احساس ہوا کہ یہ صرف تصویر کا ایک رخ ہے اس جنت کے دوسری طرف ایک جہنم بھی بسا ہوا ہے

جس کی طرف بہت کم آنکھیں اٹھتی ہیں۔ اس کی وجہ کرشن چندر کا فلسفۂ حیات ہے۔ کرشن چندر بنیادی طور پر ترقی پسند ہیں۔ ان کا دل انسان دوستی امن پسندی اور انسان پرستی کے جذبات سے لبریز ہے۔ ان کے یہاں جس طرح کا تنوع اور جدت ملتی ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کے ساتھ ساتھ ان کے ناول بھی منظر عام پر آنے لگے۔ ان کا پہلا ناول ''شکست'' کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا جو انہوں نے صرف اکیس دن میں کشمیر کے گلمرگ ہوٹل میں لکھا۔ انتشار، بے چینی اور درد و کرب سے بھرپور یہ ایک ایسا ناول ہے جس کو کرشن چندر نے کشمیر کے فطری حسن کے رومان انگیز پس منظر میں پیش کیا ہے۔ ''میری یادوں کے چنار'' کرشن چندر کا ایک سوانحی ناول ہے۔ یہ پونچھ کے پس منظر میں لکھا گیا ناول ہے، طوفان کی کلیاں، جب کھیت جاگے، سڑک واپس جاتی ہے دوسری برف باری کے بعد وغیرہ جیسے کرشن چندر کے ناولوں میں کشمیر کا حسن پورے آب و تاب کے ساتھ اُمنڈ آیا ہے۔ اس خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ان ناولوں میں کشمیر میں رہنے والوں کی مجبوری اور بے چارگی بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ کرشن چندر کے ناولوں میں بھی کشمیر کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ یہاں کے محنت کش عوام کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ وہ کشمیر کے حسن اور اس کی خوبصورتی سے بے حد متاثر تھے۔ انہیں یہاں کے بے بس عوام سے اس لئے دلچسپی تھی کہ یہ نہایت ہی محنت کش ہیں لیکن اتنی محنت کرنے کے باوجود بھی افلاس و ناداری کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ان کے خوشحالی کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ ساتھ یہ قوم بھی ترقی کی طرف گامزن ہو۔ ان کے مطابق دنیا بھر کے لوگ ان کی محنت کی داد دیتے ہیں لیکن ان کی مجبوری، بے کسی اور افلاس کے بارے میں کوئی بھی توجہ نہیں دیتا ہے۔ ان تمام باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے کرشن چندر خود رقمطراز ہیں۔

''میری زندگی کے علاوہ میرے ادب میں جو احساس جمال کسی کو ملتا ہے۔ اس کا منبع یہی فطرت ہے۔ حقیقت نگاری کا پہلا درس بھی مجھے ایک طرف سے فطرت ہی نے دیا۔

کشمیر کی خوبصورت وادیوں اور مرغزاروں میں رہنے والوں کی تہی دستی، مجبوری، بے چارگی اور غربت کا تضاد اس قدر واضح اور شدید تھا کہ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کے اسباب و علل پر غور کرنے کا جو سلسلہ چلا تو پھر بہت دور تک پہنچا۔" (۱)

کرشن چندر ایک اشتراکی ادیب تھے لہٰذا انہیں دولت کی نامساوی تقسیم اور طبقاتی جدوجہد کا احساس تھا۔ وہ سرمایہ اور محنت کی صدیوں پرانی لڑائی سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ ان کو تواریخ کا صحیح شعور بھی حاصل تھا۔ لہٰذا ان کا فن ان تمام حقائق کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ مناظر قدرت کے مقامی رنگ بو سے اپنی کہانیوں کا پس منظر تعمیر کرتے ہیں۔

کرشن چندر کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا نظر فریب طرز تحریر ہے، وہ صحیح معنوں میں نثر میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کا کلام سحر طراز ہے۔ ان کی تخلیقات کا جائزہ لینے کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنے عہد کو سب سے زیادہ متاثر کیا تو بے جا نہیں ہوگا۔ کرشن چندر محنت کش طبقے کے دوست ہیں۔ وہ اپنے قلم سے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہے۔ ان کا ادب ان کے عہد کی کھلی تاریخ ہے۔ یہ تواریخ وہ اپنی کہانیوں، بے شمار ناولوں، رپورتاژوں، ڈراموں، فیچروں اور مضامین میں پیش کر چکے ہیں۔ یہ سارا ادب ترقی پسند ہے اور عوام کی زندگی کے ساتھ گہری مطابقت رکھتا ہے۔

کرشن چندر کے معاصرین میں سے منٹو اور راجندر سنگھ بیدی قابل ذکر ہیں، یہ لوگ تقریباً ساتھ ساتھ اُبھرے اور بقول ڈاکٹر برج پریمی اردو افسانے کی تکون کہلائی۔ بیدی نے اگرچہ ان دو کے مقابلے میں بہت کم لکھا لیکن سوچ سمجھ کر لکھا اور اپنی فنی عظمت برقرار رکھی کرشن چندر نے اپنی شاعرانہ نثر سے پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی اور منٹو کہانی کہنے کا گر جانتے تھے۔ اسلئے ہر دل عزیز کہانی کار بن گئے۔ کرشن چندر بے تکان لکھتے رہے اور جلد ہی اپنا سکہ جمانے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے موضوعات میں تنوع

(۱) شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا۔ مرتبہ جنید احمد۔ ص ۱۴۰، ۱۴۱

ہے اور وہ اپنے خیالات کو نرالے انداز میں پیش کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی خوبصورت کہانیوں سے نہ صرف عوام کا دل جیت لیا بلکہ مختلف نظریات رکھنے والے ادیب بھی متاثر ہوئے۔ حتیٰ کہ منٹو جیسا خوددار فنکار بھی کرشن چندر کی کہانیوں پر عش عش کرنے لگا۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب 'منٹو کتھا' میں لکھتے ہیں:

"سعادت حسن منٹو کو طبع زاد افسانوں کی حدود میں داخل ہونے کے لئے مقابلتاً زیادہ سفر طے کرنا پڑا لیکن کرشن چندر آتے ہی اپنا سکہ جمانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ابتداء میں موضوعات کے تنوع سے زیادہ ان کی رومانیت اور دل کی تہوں میں اترنے والی ان کی شاعرانہ نثر تھی۔ حتیٰ کہ منٹو جیسا ازلی خودسر اور خوددار فنکار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور ان کا استقبال کیا۔"(۱)

کرشن چندر کی کہانیوں اور ناولوں میں طنز و مزاح کی بھرپور جھلکیاں ملتی ہے وہ اپنے دور کے تمام معاصرین طنز نگاروں میں قابل قدر مقام رکھتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز طنز نگاری سے کیا اور اپنے فارسی کے استاد پر مزاحیہ خاکہ لکھا، جو اُس دور میں بے حد پسند کیا گیا ہوائی قلعے، کرشن چندر کے مزاحیہ مضامین کا اوّلین مجموعہ ہے۔ یہ اردو طنز و ظرافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ انکی بیسیوں تحریروں میں ظرافت کی چاشنی ملتی ہے۔ جن میں پرانے خدا، تین غنڈے، ان داتا، نئے غلام، کتاب کا کفن، زندگی کے موڑ پر، لالہ گھسیٹا رام، ناگ منی، فلمی قاعدہ جانی واکر اور شیر، سمندر دور ہے، ایک گرجا ایک خندق، بڑے آدمی، بادشاہ، مہالکشمی کا پل، باتیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کرشن چندر کے انشائیے بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ اگرچہ انہوں نے اس صنف کی طرف خاص توجہ نہیں کی لیکن پھر بھی ان کے کئی انشائیے قابل

(۱) منٹو کتھا۔ از ڈاکٹر برج پریمی

مطالعہ ہیں۔ غسلیات، ٹوپ والا، جان پہچان، رونا، ہوائی قلعے کرشن چندر کے کامیاب انشائیے ہیں۔ کرشن چندر کے ڈرامے اور فیچر بھی ان کے انشائیوں کی طرح دعوت غور وفکر دیتے ہیں۔ سرائے کے باہر، قاہرہ کی ایک شام، حجامت، شکست کے بعد، دروازہ اور مس بیلا باٹلی والا ان کے اچھے ڈرامے ہیں جو اردو ڈرامانگاری کی تاریخ میں جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

کرشن چندر کا فن ذہنی عیاشی کا فن نہیں۔ وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں سے محض لوگوں کا دل نہیں بہلاتے بلکہ اپنے عہد کی تمام نحوستوں کو آشکار کرتے ہیں۔ ان کے یہاں ہر طرح کے انسان ملتے ہیں۔ ایسے بھی جو منفی رجحان کہلاتے اور وہ بھی جن کے سہارے سماج آگے بڑھتا اور سنورتا ہے۔ ان کے کرداروں میں مل مزدور بھی ہیں اور کسان بھی، فٹ پاتھ پر سونے والے بھی اور ایرانی پلاؤ کھانے والے بھی۔ فلم کے لوگ بھی اور ملازم پیشہ بھی۔ کردار نگاری میں انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کی کہانیوں میں حقیقی اور جیتے جاگتے کردار نظر آتے ہیں۔ کرشن چندر کو زبان پر کافی دسترس حاصل ہے۔ وہ ہندی زبان پر بھی گرفت رکھتے ہیں، اسی لئے ان کی تخلیقات میں ہندی اور اردو کی آمیزش ملتی ہے اور اس پر ان کا شاعرانہ نثر سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ وہ خوبصورت تشبیہات اور استعارات بھی استعمال کرتے ہیں اور محاورات اور تراکیب بھی۔ منظر نگاری میں کرشن چندر کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ الفاظ کی جادوگری سے بڑے دلکش منظر کاغذ پر اتارتے ہیں کبھی کبھی یہ مناظر دیکھ کر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ کرشن چندر کا سدا بہار قلم ہمیشہ گل کاریاں بکھیرتا ہے۔ مغربی ادب کے گہرے مطالعے نے ان کی فکر ونظر کو وسعت بخشی ہے۔ چنانچہ انہوں نے نئے نئے تجربے بھی کئے ہیں اور اردو افسانے کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا ہے جہاں وہ دنیا کے کسی افسانے کے ساتھ آنکھ ملا سکتا ہے۔ کرشن چندر کی تخلیقات کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ وہ اردو زبان کے عظیم افسانہ نگار تصور کئے جاتے ہیں۔

(جدید فکر وفن شملہ، جلد ۸۔ شمارہ ۲۹۔ اپریل جون ۱۹۹۶ء)

جگن ناتھ آزاد کی نثری تصانیف

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ محقق بھی ہیں اور تذکرہ نگار بھی، انہوں نے خاکے بھی لکھے ہیں اور مضامین بھی۔ وہ ماہر اقبال کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں اور بحیثیت انشاپرداز کے بھی بّرِ صغیر ہندوپاک میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں شاعری کے ساتھ ساتھ ایک بصیرت افروز تنقیدی ذہن بھی ملتا ہے۔

شاعری سے قطع نظر جب ہم آزاد صاحب کی نثر نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کا ایک بہت ہی نمایاں پہلو ہمارے سامنے آجاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آزاد صاحب ایک غیر جانبدار محقق اور ایک متوازن شخصیت نگار بھی ہیں۔ نثر نگاری سے ان کی بے پناہ محبت اور دلچسپی کا بین ثبوت ان کی بے شمار تصانیف ہیں جن میں اقبال کے فکروفن سے متعلق تخلیقات بھی ہیں اور سفرنامے بھی، تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی ہیں اور علمی وادبی شخصیات کے حوالے سے مقالات کے مجموعے بھی۔ لیکن ان کا پہلا عشق اقبال ہے اور اسی جذبۂ عشق نے انہیں اقبال کے فکروفن کے مختلف گوشوں کی بازیافت کرنے پر آمادہ کیا۔

پروفیسر آزاد کو ایک بہت ہی زرخیز ادبی ماحول وراثت میں ملا۔ ان کے والد تلوک چند محروم اپنے عہد کے ایک نامور شاعر تھے۔ ان کے یہاں اکثر شعروادب کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں، ان محفلوں میں حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، عبدالعزیز فطرت،

ضیا سرحدی ، اظہر امرتسری ، عبدالحمید عدم اور کئی دوسرے سرکردہ شعرا اکثر شامل ہوتے تھے۔ اسی ادبی ماحول میں آزاد صاحب کی شاعری پروان چڑھی لیکن اُنہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کے شعبے کو بھی سنجیدگی سے اپنایا۔ ان کا پہلا تنقیدی مقالہ ۱۹۳۸ء میں ''ہمایوں'' لاہور میں شائع ہوا جو اقبالؔ کے فکروفن سے متعلق تھا۔ اس کے بعد وہ نثر نگاری کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے اور ان تمام شعبوں میں انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ۔ اقبالیات کے موضوع پر آزاد صاحب کا کام بڑا وقیع تصور کیا جاتا ہے۔ اس شعبے میں ان کی تصانیف علامہ اقبالؔ کے تیئں ان کی گہری عقیدت کی غماز ہیں۔ انہوں نے اس عظیم فلسفی اور شاعر کو نہ صرف اپنی شاعری کے توسط سے خراج عقیدت پیش کیا ہے بلکہ اپنی دلکش نثر کے ذریعے بھی اقبالؔ کے فلسفے اور ان کے پیغام کو عوام تک پہنچایا ہے۔ اس ضمن میں علامہ نیاز فتحپوری نے آزاد صاحب کو نہ صرف ایک بلند فکر شاعر قرار دیا ہے بلکہ ان کی نثر پر بھی دل کھول کر داد دی ہے۔ اقبالیات سے متعلق آزاد کی تصانیف کو اقبالیات کے شعبے میں ایک اضافہ قرار دیتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں:۔

> ''جگن ناتھ آزاد صرف نہ شاعر بلکہ نقاد کی حیثیت سے بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ اقبالؔ ابتدا ہی سے اس کا محبوب شاعر رہا ہے۔ آزاد والہانہ حد تک اقبالؔ کے مداح ہیں لیکن ان مضامین میں ان کی شیفتگی نے کسی جگہ غیر منطقی شیفتگی کی صورت اختیار نہیں کی۔ اقبالؔ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آزاد نے جو کچھ ان مضامین میں لکھ دیا ہے وہ اقبالیات میں ایک اضافہ ہے'' [۲]

---

[۱] ڈاکٹر محمد اسداللہ وانی: اقبالیات آزاد، ص ۱۹۹

[۲] کتاب نما (خصوصی شمارہ) پروفیسر جگن ناتھ آزاد: شخصیت اور ادبی خدمات، ص ۹۱

پروفیسر جگن ناتھ آزاد، علامہ اقبالؔ کے پرستاروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی فکر انگیز تصانیف ''اقبالؔ اور اس کا عہد''، ''اقبالؔ اور مغربی مفکرین''، ''اقبالؔ کی کہانی (سوانح حیات بچوں کے لئے)''، ''فکر اقبالؔ کے بعض اہم پہلو''، ''اقبالؔ: زندگی، شخصیت اور شاعری''، ''محمد اقبالؔ: ایک ادبی سوانح''، ''بچوں کا اقبالؔ'' اور ''اقبالؔ اور کشمیر''، اقبالؔ کے تیئں ان کی محبت اور دل چسپی کا ثبوت ہیں۔ آزاد صاحب نے اقبالؔ کی شخصیت اور شاعری کو ایک نئے زاویے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبالؔ کے کلام اور ان کی تحریروں کا آزاد صاحب نے نہ صرف گہرا مطالعہ کیا ہے بلکہ اقبالیات سے متعلق جس قدر مواد دستیاب ہو سکا ہے، اس پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ چنانچہ اپنی ایک کتاب میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''اقبالؔ کے بارے میں جتنی کتابیں اس برصغیر میں لکھی گئی ہیں اتنی باہر لکھی نہیں گئیں۔ مختلف نقادان علم وفن نے اقبالؔ کو اپنے اپنے انداز سے خراج تحسین بھی ادا کیا ہے اور ان کی شاعری کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ میں ان نقادوں کی تصانیف کے بارے میں یہاں کچھ زیادہ تفصیل سے کہنا مناسب خیال نہیں کرتا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور علامہ اقبالؔ کی شاعری سے مجھے شغف ہوا ہے یہ کتابیں، جن کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، میرے پیش نظر رہی ہیں اور میں نے ان سے بقدر استطاعت فیض اٹھایا ہے۔''[1]

''اقبالؔ اور اس کا عہد''، جگن ناتھ آزاد کی ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ یہ ان کے تین لیکچروں پر مشتمل ہے جو انہوں نے جموں و کشمیر یونی ورسٹی کی دعوت پر لکھے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھی اور تب سے لے کر اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع

[1] پروفیسر جگن ناتھ آزاد: اقبال اور اس کا عہد، ص ۱۱

ہو چکے ہیں جن میں ''الادب'' لاہور (پاکستان) کا ۱۹۸۹ء کا ایڈیشن بھی شامل ہے۔ اس طرح سے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں شامل مقالات میں آزاد صاحب نے علامہ اقبالؔ پر عائد کئے گئے فرقہ پرستی کے الزام کی پرزور تردید کی ہے اور انہیں وطن پرست شاعر قرار دیا ہے۔ آزاد صاحب کے مطابق اقبالؔ کے ہاں تصوف کی متعدد کیفیات اور بنیادی نکات موجود ہیں اور انہوں نے اقبالؔ کے اسلامی تصوف کی روشنی میں بھی اپنے نظریات اس انداز میں پیش کئے ہیں کہ اقبالؔ پر لگائے گئے تعصب اور تنگ نظری کے الزامات کو رد کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس کتاب میں آزاد صاحب نے جس دل نشین پیرائے میں اقبالؔ اور اسکا عہد متعین کیا ہے، وہ ان کی مستحسن کوشش ہے۔

''اقبالؔ اور مغربی مفکرین'' آزاد کا ایک اور گراں قدر نثری کارنامہ ہے۔ اقبالؔ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بقول آزاد اسلامی تفکر کے ساتھ ساتھ قدیم ہندوستانی فلسفہ، مغربی فلسفہ اور مارکس اور انجلز کا جدلیاتی مادی نظام فکر بھی شامل ہے۔ پروفیسر آزاد، اقبالؔ کو ایک وسیع النظر فلسفی شاعر قرار دیتے ہیں جنہوں نے اپنے قیام یورپ کے دوران بیکن، لاک، کانٹ، شوپن ہائر، نٹشے، برگساں، دانتے، کارل مارکس، فیختے، ملٹن اور گوئٹے ایسے مغربی مفکرین و مصنفین کے نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ پروفیسر آزاد نے نہایت ہی ایمانداری سے اقبالؔ کے فکر و فن کا موازنہ ان اکابرین کے ساتھ کر کے نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اس تصنیف میں مستعمل زبان و بیان کا پیرایہ بھی قابل داد ہے۔

''اقبالؔ اور کشمیر'' آزاد صاحب کی ایک عمدہ تصنیف ہے۔ اس نثری شاہکار میں آزاد صاحب نے کشمیریات کے تعلق سے اقبالؔ کے فکر و فن کا احاطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اسداللہ وانی کے مطابق آزاد صاحب کی یہ تصنیف ''اقبال اور کشمیر'' کے تعلق سے ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ (۱) کشمیر چونکہ اقبالؔ کے آبا و اجداد کی سرزمین رہی ہے اس لئے اقبالؔ کو بھی کشمیر سے

(۱) ڈاکٹر اسداللہ وانی، اقبالیات آزاد ص ۱۸۱

والہانہ لگاؤ رہا اور انہوں نے یہاں کے کلچر اور تہذیب و تمدن کو ہمیشہ عزیز سمجھا۔ اقبال کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ کشمیری عوام جہالت کے شکنجے سے آزاد ہوں۔ اس لئے انہوں نے یہاں کے عوام کو بیدار کرنے کی ہر ممکن سعی کی، جس کا عکس ان کی شاعری اور نثری افکار میں ہر جگہ ملتا ہے۔ آزاد صاحب نے اقبال اور اہل کشمیر کے اسی فکری اور جذباتی لگاؤ کو اس کتاب میں پیش کیا ہے اقبال اور کشمیر، کشمیری میگزین، مشاہیر کشمیر، اقبال کے خطوط محمد الدین فوق کے نام، انجمن کشمیری مسلمانان لاہور، اقبال کا سفر کشمیر، اور نیٹشے سے غنی کاشمیری تک جیسے موضوعات پر آزاد نے بڑے فن کارانہ انداز میں قلم چلایا ہے اور اس پر ان کی نثر سونے پر سہاگہ ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں اقبال کو آزاد صاحب کا پہلا عشق قرار دیتے ہیں، جنہوں نے ریاست میں اپنے قیام کے دوران بہت سی قابل قدر کتابیں لکھیں اور اقبال کے ان گوشوں کی بازیافت کی جو تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ موصوف ایک جگہ رقمطراز ہیں:۔

> "پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا پہلا عشق اقبال ہے۔ ریاست میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے اقبال اور کشمیر، اقبال اور مغربی مفکرین، نشان منزل جیسی کتابیں لکھیں۔ آزاد صاحب ایک صاحب نظر محقق اور ناقد ہیں۔ انہوں نے اقبال کے کئی ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے جو گوشہ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔(۱)

"ہندوستان میں اقبالیات: آزادی کے بعد" بھی پروفیسر آزاد کی ایک فکر انگیز کتاب ہے۔ اس کتاب میں 'ہندوستان میں اقبالیات: آزادی کے بعد' اقبال: مغربی مفکرین کی نظر میں، انسان: اقبال کی نظر میں اور اقبال اور جوش جیسے موضوعات پر بحث ملتی ہے۔ آزاد صاحب کی نثر میں اقبالیات سے متعلق جو دوسری تصانیف موجود ہیں، ان میں

(۱) ڈاکٹر برج پریمی، جلوۂ صد رنگ، ص ۲۲

''بچوں کا اقبال''، ''IQBAL: MIND AND ART'' اور ''اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علمی وادبی اہمیت کے حامل ان نثری فن پاروں میں بھی فکر اقبال کے لاتعداد گوشوں کو عیاں کیا گیا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کئی سفرنامے بھی قلم بند کئے ہیں۔ ان سفرناموں میں بھی نثر آزاد کی بہترین جھلکیاں سامنے آتی ہیں۔ آزاد صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ حقیقت بیانی سے کام لیتے ہیں۔ وہ ہر ایک چیز کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اپنے قلم کی نوک سے اس کو زبان دیتے ہیں، جس سے ان کی تحریروں میں وزن اور وقار پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے سفرناموں کو بے جا طوالت سے خشک اور سپاٹ نہیں ہونے دیا ہے بلکہ ان میں اپنی فکر ونظر کی بالیدگی سے تازگی اور توانائی عطا کی ہے۔ پروفیسر آزاد صرف اپنے سفر کا ذکر سرسری طور پر کرتے ہیں بلکہ وہ اس ملک کے کلچر، تہذیب وتمدن اور ادب کو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں، جس ملک کی وہ سیاحت کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک ادیب کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں اور ایک مورّخ کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ آزاد صاحب کی اولین نثری تصنیف ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' ہے جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں وہ ڈاکٹر عبدالحق کے سفر حج کے تاثرات بیان کرتے ہوئے ہندوستانی اور پاکستانی روپے کا موازنہ بھی کرتے ہیں مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والے نارائن راؤ کی اردو دوستی سے بھی محظوظ ہوتے ہیں، جن کی گفتگو نے آزاد صاحب کا یہ خیال غلط ثابت کردیا کہ مراٹھا، اُردو زبان وادب سے محبت نہیں کرتے ہیں۔ آزاد صاحب سچے معنوں میں اُردو کے بہی خواہ ہیں۔ تقسیم ہند اور پولیس ایکشن کے بعد جب حیدآباد میں سیاسی اور معاشی سطح پر بہت سے مسائل ابھرے تو اُردو زبان بھی اس کی زد میں آگئی۔ لیکن کسی نے اُردو کی حالت زار پر اف تک نہیں کی۔ آزاد صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے سفر کے دوران حیدرآباد میں اُردو زبان وادب کا حال دریافت کیا اور صورت حال کو تسلی بخش پا کر اطمینان کا سانس لیا۔

''کولمبس کے دیس میں'' آزاد صاحب کا دوسرا سفرنامہ ہے یہ سفرنامہ ان کی ۱۹۸۱ء کی امریکہ اور کینیڈا کی یادوں پر مشتمل ہے اور انتہائی دلچسپی کا حامل ہے۔ اگرچہ آزاد صاحب کی امریکہ کی سیاحت کا وہ پہلا موقع تھا لیکن امریکہ میں ان کے قدردانوں کی وجہ سے انہیں وہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہ ہوا۔ آزاد صاحب کے اس سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ امریکہ کے قدرتی مناظر سے بھی لطف اندوز ہوئے اور سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی سے بھی۔ امریکہ اور کینیڈا میں اُردو زبان وادب کی مقبولیت دیکھ کر پروفیسر آزاد بہت ہی متاثر ہوئے خاص طور پر ان کے اس سفرنامے سے اس بارے میں بھی بھرپور جانکاری ملتی ہے کہ ان ممالک میں اقبال کے فکروفن پر کس قدر کام ہو رہا ہے۔ علم وادب کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کا ذکر بھی اس سفرنامے میں موجود ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ''پشکن کے دیس میں'' کے نام سے بھی ایک عمدہ اور قابل قدر سفرنامہ لکھا ہے۔ ۱۰۴/صفحات پر مشتمل اس سفرنامے میں انہوں نے اپنے تین ہفتوں کے قیام روس کی مصروفیات کو قلم بند کیا ہے۔ انور سدید، آزاد صاحب کے اس سفرنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جگن ناتھ آزاد ایک ایسے زائر نظر آتے ہیں جو ماسکو کے بجائے کتابوں کی یاترا کر رہے ہیں اور کتابیں لکھنے والوں سے ملاقاتیں ہی ان کی زندگی کا بالعموم اور اس سفرنامے کا حاصل ہے''۔ ۱؎

پروفیسر آزاد نے روس کے معاشی اور معاشرتی حالات کا جائزہ بھی اس سفرنامے میں بڑے مؤثر انداز میں لیا ہے۔ وہ روس کے علم دوست حضرات سے ہم کلام بھی ہوئے اور

۱۔ ڈاکٹر خلیق انجم، جگن ناتھ آزاد: حیات اور ادبی کارنامے، ص ۲۰۴

ماسکو یونیورسٹی میں انہوں نے اپنا مقالہ بھی پیش کیا۔ لینن میوزیم میں بھی چند لمحے گزارے اور تالستائی میوزیم بھی گئے، جہاں انہوں نے اس عظیم ادیب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس سفرنامے میں پروفیسر آزاد اکثر جگہوں پر مناظر قدرت کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ چونکہ انہیں کشمیر سے لگاؤ ہے، اس لئے انہیں روس میں جگہ جگہ کشمیر کے سرسبز اور شاداب مناظر نظر آتے ہیں۔ اس سفرنامے میں آزاد صاحب کا خلوص جگہ جگہ ٹپکتا ہے۔ وہ سادہ زبان اور دلکش اسلوب میں اپنی بات کہنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ پروفیسر ظہورالدین نے آزاد صاحب کے اس سفرنامے کو اُردو کے ادبی خزانے میں اہم اضافہ قرار دیا ہے۔ [1]

''حیات محروم'' میں آزاد صاحب نے اپنے والد اور اُردو کے صف اوّل کے شاعر (مرحوم) تلوک چند محروم کی شخصیت اور فن کا احاطہ کیا ہے۔ اس میں انہوں نے محروم صاحب کے دور کا تاریخی اور سماجی پس منظر پیش کرتے ہوئے اکبر الٰہ آبادی، سر شیخ عبدالقادر اور اقبال کے ساتھ محروم کے مراسم کا بھی ذکر کیا ہے۔ ''حیات محروم'' سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ اقبال، محروم صاحب کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں اُردو شاعری کا کیٹس کہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ زیر بحث کتاب میں آزاد نے تقسیم ہند کے المناک واقعات اور ان کے آبائی مکان عیسیٰ خیل (مغربی پاکستان) میں آراستہ ہونے والی ادبی محفلوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ والد کے احباب میں سے وہ جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، عبدالحمید عدم، احسان دانش، ہری چند اختر، امتیاز علی تاج، برج موہن کیفی، عبدالمجید سالک، صوفی تبسم، مولانا تاجور نجیب آبادی، صلاح الدین احمد، مولانا ظفر علی خان اور عابد علی عابد ایسے مشاہیر کا ذکر جابجا کرتے ہیں۔ یہ کتاب محروم صاحب پر ایک ''انسائیکلوپیڈیا'' کا درجہ رکھتی ہے اور ان کے بچپن سے وفات تک پوری پوری تفصیل قاری کو فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب میں آزاد صاحب کا مخصوص اسلوب بھی جگہ جگہ عیاں ہے۔

(۱) ڈاکٹر ظہورالدین، ارمغان آزاد، ص ۱۸۷

''آنکھیں ترستیاں ہیں''اور''نشان منزل'' پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی متفرق موضوعات پر دو تصانیف ہیں، جن کی انفرادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔آزاد صاحب کی دیباچہ نگاری بھی ان کی غیر معمولی ذہانت کی نشاندہی کرتی ہے۔بیسیوں قلم کاروں کے شعری اور نثری مجموعوں پر انہوں نے نہایت ہی فکر انگیز دیباچے اور مقدمات رقم کیے ہیں۔بعض تصانیف پر انہوں نے تقاریظ بھی لکھی ہیں اور آرا بھی اور ہر اعتبار سے ان کی تحریریں نثر کے بہترین اور منفرد نمونے ہیں۔اُن کے دیباچے اور مقدمات ایک وقیع علمی سرمایہ ہیں اور تحقیق وتنقید کے گنجینے میں بیش قیمت لعل وگوہر کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ وادبی لحاظ سے بھی ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔آزاد صاحب کے حواشی بھی غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ ان کی محنت، ذہانت اور خداداد صلاحیت ہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اُردو زبان وادب کے حوالے سے بعض ایسی چیزوں کو تلاش کیا جن پر زمانے کی ناقدری کی دھول جمی ہوئی تھی۔ پروفیسر آزاد کے ہاں آج کل کے بہت سارے نقادوں کی طرح اشعار اور اقتباسات کی بھر مار نہیں ملتی ہے لیکن وہ اپنی تنقیدوں میں کتابوں اور ادبی شخصیتوں کے نادر ادبی تحریکوں سے متعلق واضح اشارے ضرور کرتے ہیں اور اس طرح اپنی تحقیق وتنقید کو باوزن بناتے ہیں۔ وہ ایسی نثر پسند کرتے ہیں جس میں نہ صرف علمیت کا مظاہرہ کیا گیا ہو بلکہ خیال بھی ستھرا اور نکھرا ہوا ہو۔آزاد صاحب کی تحریروں میں داخلی وحدت ہے۔ قیاس آرائیوں پر عمل کرنا ان کے مزاج میں نہیں ہے بلکہ وہ پہلے تحقیق کرتے ہیں اور اس کے بعد وضاحت کے ساتھ اپنا نظریہ بیان کرنے کے قائل ہیں۔ فکر انگیز خیالات کو تحریر کرتے وقت منفرد انداز اختیار کرنا ہی اُن کا خاصہ ہے۔تنقیدی میزانوں کو اپناتے وقت وہ تعصب سے کام نہیں لیتے ہیں اور نہ ہی فیصلہ دیتے وقت دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ وہ انوکھے انداز میں بات کہنے کا گُر رکھتے ہیں۔ زبان وبیان کے معاملے میں بھی جو خدمات اُنہوں نے انجام دی ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

عبدالغنی شیخ: چند نئے مباحث

ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں تاہم جن افسانہ نگاروں نے اپنے ذہن رسا سے اس فن کو آگے بڑھایا۔ ان میں پریم ناتھ پردیسی، رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور، برج پریمی، بنسی نردوش، دیپک کول، تیج بہادر بھان، حامدی کاشمیری، پشکرناتھ، ہری کرشن کول نورشاہ وغیرہ پیش پیش ہیں۔ اس فہرست میں عبدالغنی شیخ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے افسانوں میں لداخ کی تہذیب اوراس کے کلچر کی بھرپور عکاسی اور موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔

عبدالغنی شیخ ۱۹۳۶ء میں کو دنیا کے بلند ترین مقام لیہہ لداخ میں ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی۔ گھر میں افلاس اور ناداری کے سائے ابتداء سے ہی منڈلا رہے تھے لیکن ہمت اور حوصلے سے انہوں نے ان تمام حالات کا مقابلہ کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ آخر ذریعہ معاش کی تلاش میں سرینگر پہنچ گئے اور وہاں ویڑنری اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کی۔ یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ اپنے مضمون 'یادوں کے لمس' میں اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے خود رقمطراز ہیں:

"۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ میں سرینگر میں ویٹرنری
اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کرر ہاتھا۔ میٹرک پاس
کیاتھا۔آگے پڑھنے کا شوق تھا۔لیکن غربت کی وجہ سے کالج
میں داخلہ نہیں لے سکا۔"(۱)

عبدالغنی شیخ نے زندگی میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔انہوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا شغل بھی جاری رکھا اور اس طرح سے کئی امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کئے۔اسی دوران وہ وزارت اطلاعات ونشریات کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔مطالعہ اور کتب بینی کا چسکہ بچپن سے ہی ان کی گتھی میں پڑا ہوا تھا چنانچہ ابتداء سے ہی انہوں نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور افسانے لکھنے شروع کئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری وساری ہے۔ان کے متعدد افسانے ڈرامے، خاکے اور مضامین ملک کے معیاری رسائل میں چھپ چکے ہیں اور مقبول عام ہو چکے ہیں۔شیخ ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں اور کرشن چندر سے کافی متاثر ہیں ان کے بارے میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

"کرشن چندر کا نام جب لیا جاتا ہے تو ذہن باغ و بہار
ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے جلوۂ حسن ہزار رنگ کی طرح
ایک رنگین چمن کا سماں کھینچ جاتا ہے جس میں رنگ برنگے
پھول کھلے ہیں اور شوخ وشنگ تتلیاں فضا میں جھوم رہی ہیں۔
یہ جان دار تاثرات کرشن چندر کے خوبصورت الفاظ عطا کرتے
ہیں جو کہانیوں اور ناولوں کے روپ میں پڑھنے کو ملتے
ہیں۔"(۲)

(۱) برج پریمی۔ایک مطالعہ مرتبہ پریمی رومانی۔ص ۱۷
(۲) ماہنامہ شاعر بمبئی کرشن چندر نمبر۔ص ۲۳۹

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عبدالغنی شیخ شروع میں کمال لداخی کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ان کے کئی ابتدائی افسانے اسی نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ان کا ایک افسانہ لوسر اور آنسو ۱۹۵۸ء میں ماہنامہ 'دیش' سرینگر میں شائع ہوا جسکے ادارتی فرائض میرے والد محترم آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی انجام دیتے تھے۔اس زمانے میں ملک میں اردو ادبی رسائل کا اکال تھا۔رسائل نکلتے تھے جو گروہ بندی کا شکار ہوتے رہے۔نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی۔ایسے میں سرینگر سے ایک ادبی رسالہ نکلنا ایک نیک فال ثابت ہوا۔عبدالغنی شیخ (کمال لداخی) ایک نیا ادبی رسالہ دیکھ کر خوش ہوئے۔اس خوشی کا اظہار وہ آنجہانی برج پریمی کے نام اپنے ۱۶/اپریل ۱۹۵۸ء کے خط میں یوں کرتے ہیں:

"گرامی نامہ ملا اور بڑی مسرت کے درمیان یہ پڑھا کہ اخبار سہ روزہ 'دیش' سرینگر نے ایک رسالہ اجرا کیا ہے۔ایسے ہی ایک رسالے کی بڑی ضرورت تھی۔وطن کے ادیبوں کے پاس ہمیشہ تخلیقات رہتی ہیں لیکن کوئی ایسا ادبی ماہنامہ نہیں جو مستقل طور پر ان تخلیقات سے وطن اور بیرون وطن کے لوگوں کو روشناس کرائے اور یہ کتنی المناک حقیقت ہے۔خدا کرے ہمارا یہ ماہنامہ ہمارے سابقہ دوسرے رسائل کی طرح پہلی ہی منزل پر دم نہ توڑ دے اور سابقہ خامیوں کی تلافی کرے"(۱)

عبدالغنی شیخ بہ یک وقت ایک افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی، سوانح نویس بھی اور محقق بھی لیکن افسانہ ان کا پہلا عشق ہے۔وہ اس وقت تک متعدد افسانے لکھ چکے ہیں جو ملک کے مختلف اخبارات اور جرائد کی زینت بن چکے ہیں۔لکھنے کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔اپنے ادبی سفر کے آغاز کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

"سرینگر میں ان دنوں گاہے گاہے کسی ہوٹل یا کسی ادیب

۱) ماہنامہ دیش سرینگر مارچ ۱۹۵۸ء، ص ۴۰۔

کے گھر ادبی مجلس منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جلد ہی مجھے ان کی
بو باس مل گئی اور میرا ادبی ذوق مجھے ان مجلسوں میں کھینچ لے گیا۔
ادب کا چسکا میں لیہہ سے اپنے ساتھ لایا تھا اور لکھنے کی چھوت
بھی لگی تھی لیکن یہ چھوت بڑی خوبصورت اور نفع بخش تھی اس
نے مجھے حوادثِ زمانے کا مقابلہ کرنے، جینے اور زندگی میں
آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔"(۱)

'زوجی لا کے آر پار' عبدالغنی شیخ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں ان کی ابتدائی کہانیاں شامل ہیں۔ ان افسانوں میں افسانہ نگار نے طبقاتی کشمکش، سماجی نابراری، رشوت خوری اور ظلم وتشدد کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان افسانوں میں پیار ومحبت کی جھلکیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ اگرچہ ان افسانوں میں عبدالغنی شیخ کا فن اپنے جوبن پر نظر نہیں آتا لیکن پھر بھی فکر کی جلوہ سامانیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔

عبدالغنی شیخ کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'دوراہا' ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ ۲۳ افسانوں پر مشتمل ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس میں وہ ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ عبدالغنی شیخ منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ بظاہر یہ مختلف اوقات میں لکھی گئی کہانیاں ہیں لیکن ان میں پلاٹ سازی، کرداری نگاری، واقع نگاری منظر نگاری کے ساتھ ساتھ فکر وفن کی تازگی بھی ملتی ہے۔ یہ اُس سرزمین کی کہانیاں ہیں جہاں کے لوگ سیدھے سادے، محنتی اور حسن واخلاص کے پیکر ہیں۔ یہ خطہ ریاست کے دوسرے خطوں سے مختلف ہے۔ یہاں کا رہن سہن، لباس، کلچر اور تہذیب اسلامی اور بودھی روایات کا سنگم ہے۔ چنانچہ ان تمام چیزوں کی عکاسی عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ عبدالغنی شیخ کو اپنے مادر وطن لداخ سے والہانہ عشق ہے۔ انہیں اس کا کلچر، تہذیب اور تمدن بڑا عزیز ہے۔ اپنے ایک خط میں میرے والد مرحوم کو لکھتے ہیں:

(۱) برج پریمی۔ ایک مطالعہ مرتبہ پریمی رومانی، ص ۷۱

"لداخ میرا وطن ہے ۔ یہاں کے تمدن ومعاشرت کی نیرنگیاں میرے ذہن میں آج بس گئی ہے ۔ ہر گھر کے کنج اور ہر کوچے کی نکڑ پر مجھے یہاں کی معاشرت سے متعلق کہانیاں بکھری ملتی ہیں۔اور میں ان کی عکاسی کرنا اپنا پہلا فرض جانتا ہوں۔آپ مجھ سے اور کہانیاں ڈرامے وغیرہ طلب کر سکتے ہیں۔جو یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے نقاب اٹھاتی ہیں۔"(۱)

عبدالغنی شیخ کو افسانوی تیکنیک پر پوری گرفت ہے۔وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے گریز کرتے ہیں ۔ان کے ہاں بے جا عبارت آرائی بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنی کہانیوں میں فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ جچے تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ لداخ میں بیٹھ کر کبھی ولی یا کسی اور شہر کی بات نہیں کرتے بلکہ یہاں کے اِردگرد کے ماحول کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ان کے کردار جانے پہچانے کردار ہوتے ہیں۔وہ کبھی فرسودہ اور غیر متحرک کرداروں کو پیش نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے کردار افسانے کے پلاٹ کے گرد کچھ اس طرح گھومتے ہیں کہ ایک جانی پہچانی دنیا آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔علی باقران کی کردار سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ کردار عام زندگی سے لئے گئے ہیں اور جیتے جاگتے صحت مند اور توانا لگتے ہیں ۔ وہ حالات کے نابینا غلام نہیں ہیں اور سماج اور تہذیب کے بلند رتبوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ شیخ حقیقت نگاری کے قائل ہیں اور اپنے کرداروں کے احساسات نفسیات اور ماحول سے خوب واقف ہیں۔"

۱) ماہنامہ دیش، سرینگر ۱۹۵۸ء، ص ۵۰۔

۲) دوراہا از عبدالغنی شیخ

عبدالغنی شیخ کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ان میں پیار و محبت کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے اور سماجی نابراری کا احساس بھی، ظلم وتشدد کے واقعات بھی ہیں اور وطن سے محبت بھی۔ بعض کہانیوں میں بھرپور طنز ملتا ہے۔ وہ سماج، سوسائٹی اور فرد پر کبھی کبھی طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں۔ شیخ کے افسانوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے۔اس ضمن میں رشتے ناطے قاتل، دل ہی تو ہے، نہتے ہاتھ، بانجھ، مقابلہ، آزمائش، دوراہا اور ہوا جیسے افسانے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ چند نمائندہ افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے جن میں لداخ کے ماحول اور اس کے کلچر اور تہذیب کی نمائندگی کی گئی ہے۔مثلاً۔

''چھنگ (جو کی شراب) کے کئی جام چڑھانے کے بعد اس کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا اور وہ اونچی اونچی آواز میں باتیں کرنے لگا۔عورت بار بار اس کا ساغر بھرنے لگی۔ پندرہ پیالیاں لینے کے بعد جب عورت نے خالی جام بھرنے کیلئے دوبارہ صراحی اٹھائی تو اس نے اس کا ہاتھ روک لیا۔جیب سے بٹوا نکالا اور دس دس روپے کے دو نوٹ عورت کو دیئے۔عورت نے تین روپے واپس کردیئے جو اس نے احتیاط سے بٹوے میں رکھ لئے۔'' (مقابلہ،ص۱۴۳۔۱۴۴)

''حامد رُک رُک کر بولنے لگا لیکن نہیں جانتی میری، جہاں میں رہتا ہوں، وہ جگہ لیہہ سے بالکل بدتر ہے۔لیہہ میں سیاحوں کی آمد کی وجہ سے بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں ۔ یہاں موجودہ زمانے کی ساری بنیادی سہولتیں میسر ہیں ۔ لیکن میرے گاؤں میں ابھی کوئی سہولت نہیں کوئی ریستوران نہیں، کوئی ریڈنگ روم نہیں، یہاں تک کہ بجلی بھی نہیں۔ دھول گرد ،ریت میرے گاؤں کے تحفے ہیں۔گاؤں تک سڑک بھی نہیں

جاتی چنانچہ سنگ ریزوں اور دھول سے اٹی ہوئی چار کلومیٹر لمبی ایک ڈھلوان پگڈنڈی پیدل طے کرنے کے بعد ہم اپنے گھر پہنچتے ہیں۔(آزمائش۔ص ۴۳ ۷)

''نجمہ کی بانجھ ہونے کی بات ساس، سسر اور نندوں بھاوجوں کے بعد اب دادای اماں کی زبان پر اکثر آنے لگی تھی۔ نجمہ نے محسوس کیا کہ کچھ دن سے اس کے ساتھ گھر میں ایک سردمہری سی برتی جارہی ہے۔اس نے کئی مرتبہ نندوں اور بھاوجوں کو کانا پھوسی کرتے دیکھا جب وہ اُن کے پاس جاتی، وہ خاموش ہوجاتیں۔ پہلے پہل وہ ان کی رویہ پر پریشان ہوئی لیکن اب وہ بات سمجھ گئی تھی۔ ان سرگوشیوں کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ اس کی گود پچھلے چار سال سے خالی تھی۔اس کے ساس سسر نے کئی مرتبہ اپنے بیٹے کے اولاد کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔شروع شروع میں ان کے لہجے میں نرمی اور ہمدردی ہوتی تھی، لیکن اب ان کے لہجے میں ملامت اور تہمت جھلکتی تھی۔''(بانجھ۔ص ۱۱۴)

عبدالغنی شیخ ایک اچھے ناول نگار بھی ہیں۔''وہ زمانہ'' ان کا لداخ کے ماحول اور اس کے تہذیب اور کلچر پر ایک تاریخی ناول ہے۔ان کا دوسرا ناول 'دل ہی تو ہے' جو ۱۹۷۸ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو لداخ کی ایک دوشیزہ کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے لیکن پھر جب ان کی محبت کے درمیان میں ایک اور کردار آتا ہے تو یہ کہانی نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ شیخ کا ناول 'دِل ہی تو ہے' سونم اور پدماں کی محبت کی داستان ہے۔انہوں نے اس محبت کو خالص لداخ کے پس منظر میں پیش کیا ہے اور کامیابی سے زینہ بہ زینہ طے کرکے اس داستان کو ایک ایسے موڑ پر لایا جہاں خود بخود تضاد پیدا

ہوجاتا ہے۔ یہ دراصل سماج کا ٹکراؤ ہے۔اس میں نیاں کا کردار داخل ہونے سے کشمکش پیدا ہوجاتی ہے۔لیہہ کے ماحول اور یورپی سیاحوں کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ دلچسپ رومانی ناول ہے۔عبدالغنی شیخ کی کہانیوں کا مجموعہ ''دوملک،ایک کہانی'' اگست ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔اس مجموعے میں ۴۵ کہانیاں ہیں۔اس میں سنجیدہ کہانیاں بھی ہیں اور مزاحیہ کہانیاں بھی۔ان کہانیوں میں عام طور پر کشمیر کے مسائل کو اُبھارا گیا ہے۔ جو قابل مطالعہ ہیں۔

عبدالغنی شیخ نے نہ صرف افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں ہی اپنی طبیعت آزمائی ہے بلکہ انہوں نے بحثیت ایک سوانح نویس کے بھی قابل قدر نام پیدا کیا ہے۔ان کی کتاب 'صنم فربو' بھی ایک اچھی کوشش ہے۔اس کتاب میں انہوں نے ملک کے سرکردہ انجینئر، سفیر اور سیاستدان مرحوم صنم نربو کے کارناموں کو لوگوں کے سامنے رکھا ہے۔ جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے سرینگر سے لیہہ جانے والی قومی شاہراہ تعمیر کر کے ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔اُن کے ادب، ثقافت اور لداخی کلچر اور تاریخ پر متعدد مضامین شائع ہوچکے ہیں جو اپنی جگہ مسلم ہیں۔

ماہنامہ 'تعمیر' سرینگر، اکتوبر ۱۹۹۳ء

محمد یوسف ٹینگ ۔ ایک مطالعہ

ریاست کے جن قلمکاروں، عالموں اور دانشوروں نے اردو زبان وادب کی بے لوث خدمت کی اور تحقیق وتنقید کو اپنا موضوع خاص بنایا، ان میں عبدالاحد آزاد، نند لال طالب، نرسنگھ داس نرگس، دیا کشن گردش، بلدیو پرشاد شرما، عشرت کاشمیری، اکبر حیدری، رحمٰن راہی، قیصر قلندر، حامدی کاشمیری، شمیم احمد شمیم، برج پریمی موتی لال ساقی، مرغوب بانہال وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ محمد یوسف ٹینگ کا نام عالموں اور دانشوروں کی اسی فہرست میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ ۱۹۳۵ء میں سرینگر سے تقریباً ۴۰ کلومیٹر دور شوپیاں کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خواجہ عبدالرزاق ٹینگ ایک باوقار اور خداترس بزرگ تھے۔ ٹینگ صاحب نے ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی، بی اے (آنرز) پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی، چونکہ بچپن سے ہی اُن کو ادب اور صحافت سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس لئے آپ سب سے پہلے ہفتہ وار اخبار 'جہان نو' سرینگر سے وابستہ ہوگئے۔ آپ کچھ عرصہ تک ریڈیو کشمیر سرینگر میں بحیثیت نیوز ریڈر بھی کام کرتے رہے۔ (۱) اس کے بعد ریاستی محکمہ اطلاعات کی طرف سے شائع ہونے والے جریدے ماہنامہ 'تعمیر' کے نائب مدیر مقرر ہوئے، بعد میں آپ اس کے مدیر ہوگئے۔ ۱۹۶۲ء میں آپ نے ریاستی کلچرل اکادمی

---

۱) باؤتھ (محمد یوسف ٹینگ نمبر) اکتوبر ۱۹۹۶ء مارچ ۱۹۹۷ء، جلد ۹، ص ۶

کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے شیرازہ کی ادارت سنبھالی۔ یہ رسالہ بہت ہی قلیل عرصے میں آپ کی محنت اور خداداد صلاحیت سے ادبی دنیا میں اپنا وقار بنانے میں کامیاب ہوا۔ ٹینگ صاحب مختلف اخبارات کے کالم نویس بھی رہے ہیں۔ ریاستی کلچرل اکادمی کے سکریٹری کے فرائض نبھاتے ہوئے آپ ڈائریکٹر جنرل کلچر بھی رہے۔ آپ کچھ عرصہ کے لئے ناظم اطلاعات بھی رہے۔ ابھی چند برس پہلے ریاستی کلچرل اکادمی کے سکریٹری کے عہدے سے آپ ریٹائر ہوئے اوراب لکھنے پڑھنے کے کام میں منہمک ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ریاستی پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں۔ ٹینگ صاحب ساہتیہ اکادمی کے کشمیری ایڈوائزری بورڈ کے کنوینئر ہیں۔ اسکے علاوہ آپ سکریٹری شیر کشمیر میموریل کمیٹی سکریٹریر شیخ العالمؒ شش صد سالہ کمیٹی اور سکریٹری سال للہ دید کمیٹی بھی ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ صرف ایک فرد کا نام نہیں بلکہ وہ ایک انسٹی ٹیوشن ہیں۔ وہ ادیب بھی ہیں اور صحافی بھی۔ دانشور بھی اور محقق بھی، انجمن ساز بھی اور ایڈمنسٹریٹر بھی ان کی شخصیت تہہ دار اوران کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ ٹینگ صاحب کے متنوع ادبی کارناموں پراس مختصر سے مقالے میں اظہار خیال کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ انہوں نے زبان وادب تاریخ وتمدن اور تہذیب وکلچر کے گوناگوں پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ اوراپنے خیالات کا اظہار بڑے مؤثر ڈھنگ سے کیا ہے۔ ان کا مطالعہ گہرا اور مشاہدہ غضب کا ہے۔ ٹینگ صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ وہ مہتاب تخلص کرتے تھے۔ بعد میں ایک مدت تک معصوم کے نام سے بھی لکھتے رہے۔ ٹینگ صاحب اردو اور کشمیری دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اوران سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ انگریزی زبان سے بھی انہیں گہرا لگاؤ ہے۔ چنانچہ کشمیر۔ ڈریم اینڈ دیہ ڈالیما، کے نام سے ان کی کتاب عنقریب ہی شائع ہورہی ہے۔ اس کے علاوہ ٹینگ صاحب اردو اور کشمیری نظم ونثر میں تقریباً دو درجن کتابیں ایڈیٹ کر چکے ہیں جن میں ریاستی کلچرا کادمی کی طرف سے شائع ہونے والے رسالہ شیرازہ، کے خاص نمبر اور سالنامہ ہمارا ادب، کے تقریباً گیارہ شماروں

کے علاوہ 'داغ تہ دگ' گلریز، کلیات مہجور، کلیات ولی اللہ متو، وطن پچھے نادلایان (کشمیری) رسول میرؔ کی نمائندہ نظموں کا اردو ترجمہ، وطنی وقومی نظموں کا مجموعہ وطن کی پکار، عبدالاحد آزاد کی کتاب، کشمیری زبان اور شاعری کی دوسری اور تیسری جلد، عبدالقادر سروری (مرحوم) کی کتاب، کشمیر میں اردو، لوک ادب نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ٹینگ صاحب ایک بالغ نظر نقاد ہیں۔ وہ ادب کے مارکسی نظریئے سے متاثر ہیں۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، ناصر کاظمی، منٹو اور کشمیری ادبیات میں رسول میر، مہجور، للہ دید، شیخ العالمؒ، عبدالاحد آزاد، رسا وغیرہ ان کے اہم موضوعات ہیں۔ وہ کشمیری تاریخ ثقافت، تہذیب وتمدن اور کلچر پر بھی گہری برج پریمی اپنی کتاب میں ٹینگ صاحب کے عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''محمد یوسف ٹینگ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بالغ نظر نقاد ہیں۔ وہ اردو اور کشمیری ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غالب، اقبال، منٹو اُن کے محبوب موضوع ہیں۔ کشمیری اور اردو کے شعر وادب سے متعلق انکے بعض عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے چھپ چکے ہیں...... ان کے شگفتہ اسلوب اور منطقی استدلال سے ایک نئی سوچ وفکر کا احساس ہوتا ہے'' (۱)

ٹینگ صاحب کا پہلا تحقیقی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ 'شناخت' کے نام سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کے انیس مضامین شامل ہیں۔ یہ مضاین گذشتہ تیس، پینتیس برس میں لکھے گئے مختلف ادبی وثقافتی موضوعات پر دال ہیں اور عالمانہ بصیرت رکھتے ہیں۔ قرانیات کی نادر دریافت، ایک ادبی سرقے کا سنسنی خیز انکشاف، علامہ اقبال اور محمد دین فوق، ہی مال۔ اسطور، تاریخ اور ادب، مدیر کے مسائل، ہمالیہ کی گود میں، رات رقص اور رسول میر، گلریز، ترجمہ جو تخلیق بن گیا وغیرہ ان کے چند موضوعات ہیں، جو دلچسپ بھی

---

۱) جلوۂ صدرنگ۔ ڈاکٹر برج پریمی ص ۲۱۶

ہیں اور معنی خیز بھی۔ ان مضامین کا مطالعہ کرنے سے ٹینگ صاحب کی فنی بصیرت، ژوف نگاہی اور دیدہ وری کا پتہ چلتا ہے۔

ٹینگ صاحب اپنے مادرِ وطن کشمیر سے بے پناہ عشق کرتے ہیں۔ انہیں کشمیر کی تاریخ، تہذیب اور کلچر سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ یہاں کے صحت مند اقدار عزیز رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کی اکثر تحریروں میں کشمیر کی مٹی کی بو باس محسوس کی جاسکتی ہے۔ کشمیر کے شعر و ادب کا منظر نامہ ہو یا کسی نادر نسخے کی دریافت، ٹینگ صاحب کی دوربین آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں رہتا، بلکہ وہ تلاش و جستجو سے نہ جانے کتنی تہیں کھول دیتے ہیں اور پھر نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور یہی چیز اُن کو اپنے معاصرین میں ایک الگ اور منفرد مقام دلاتی ہے۔ چنانچہ شناخت، میں ان کا یہی جذبہ کارفرما ہے۔ خود تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس کتاب میں کشمیر اور کشمیر سرائی سارے مضامین میں ایک اندرونی ربط قائم کرتی ہے۔ اکثر مضامین جو براہِ راست کشمیر یا کشمیری ادب سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ ایسے ادیبوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے خمیر میں کشمیر رچا بسا ہوا تھا۔'' (۱)

ٹینگ صاحب کا دوسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ تلاش کے نام سے شائع ہو چکا ہے یہ کشمیری زبان وادب کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں علمی تنقید کے بہت ہی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ شیخ العالمؒ ہو یا للہ دید، پرمانند ہو یا رسول میر، نادم ہو یا کامل، ٹینگ صاحب کا قلم بے تکان چلتا ہے۔ وہ اپنے خیالات سے نئے نئے رنگ بھر دیتے ہیں۔ اور اپنی تحریروں میں نئی روح پھونک دیتے ہیں۔

ٹینگ صاحب کی ایک اور کتاب 'مہجور شناسی' بھی شائع ہو چکی ہے۔ یہ کشمیری زبان وادب میں منفرد کوشش ہے اور اضافے کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب شاعرِ کشمیر مہجور کی شخصیت اور ان کی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے اور ان کے بعض اہم گوشے

۱) 'شناخت'۔ محمد یوسف ٹینگ۔ ص ۲۲۵

سامنے لاتی ہے۔اس کتاب پر ریاستی کلچرا کادمی نے ٹینگ صاحب کوایوارڈ سے نوازا۔

ٹینگ صاحب کے اور بھی متعدد ادبی کارنامے ہیں، جن کا ذکر کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے، آپ نے کشمیری زبان کے چند نامور شعراء کے کلام کوتلاش بسیار کے بعد مرتب کر کے شائع کیا ہے اوران کی شخصیت اور شاعری پر مدلل بحث کی ہے۔ان میں مقبول شاہ کرالہ واری، مہجوراور رسول میر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔کلیات رسول میر کوآپ نے منفرد انداز میں ایڈٹ کیا ہے وہ نہ صرف قابل داد ہے بلکہ اس طرح سے آپ نے کشمیری زبان کے صف اوّل کے شعرا کے مکمل کلام کوتلف ہونے بچایا ہےاور ساتھ ہی ساتھ ان کی آواز عام لوگوں تک پہنچائی ہے۔

آپ کی نگرانی میں ریاستی کلچرا کادمی نے چند بہت ہی اہم پروجیکٹوں پر کام کیااور ان کوعملی جامہ پہنایا۔ جن میں کاشرڈکشنری (دوجلدوں میں) اُردو کشمیری فرہنگ (۱۲ جلدوں میں) اور کاشرانسیکلو پیڈیا (دوجلدوں میں) شامل ہیں۔آپ کی سرپرستی میں ریاستی کلچرا کادمی کے زیراہتمام اکادمی ، کے نام سے ایک خوبصورت خبرنامہ، برس ہابرس تک شائع ہوتارہا۔اس خبرنامے نے ملک گیر مقبولیت حاصل کی تھی۔ پرانے مسودات کے وضاحتی کٹیلاگ کی ترتیب ،مختلف شعراء کے قبروں پر کتبے نصب کروانا اورقدیم کشمیری زیورات کوجمع کرکے محفوظ کرنا بھی ٹینگ صاحب کے دیگر علمی ادبی اور تحقیقی کارناموں میں شامل ہے۔آپ کی سربراہی میں بسوک میں یوسف شاہ چک کی قبر پرکتبہ نصب کیا گیا اوراس طرح سے آپ نے کشمیر کے حقیقی فرزند ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

ٹینگ صاحب کے متعدد علمی وادبی کارنامے ہیں جن کوکسی بھی صورت میں صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔انہوں نے نہ صرف اردو کشمیری ڈوگری ، ہندی اور پنجابی زبانوں میں 'شیرازہ' باقاعدگی کے ساتھ جاری کرنے کا کام عمل میں لایا بلکہ ان زبانوں کے علاوہ انہوں نے اپنی نگرانی میں انگریزی، پہاڑی، گوجری اورلداخی کلچر، تہذیب وتمدن اورادب کوفروغ دینے کے لئے بہت سارے اقدامات کئے۔اس طرح سے ان زبانوں کوترقی

وفروغ دینے میں انہوں نے اپنا بھرپور تعاون پیش کیا۔

ٹینگ صاحب نے وقتاً فوقتاً پہاڑی اور گوجری زبانوں میں اعلیٰ پیمانے پر مشاعروں سمیناروں اور مباحثوں کا انعقاد بھی کروایا۔ یہ انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ان دونوں زبانوں میں تاریخ کلچر تہذیب ثقافت کے ساتھ ساتھ ادب کے گوناگوں موضوعات پر معیاری ادب شائع ہونے لگا۔ ان کی سرپرستی میں گوجری زبان میں ڈکشنری شائع ہوئی۔ اس طرح سے انہوں نے علاقائی زبانوں کی بھی بے لوث خدمت کی۔

ٹینگ صاحب کی دیباچہ نگاری بھی ان کی غیر معمولی صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے کشمیری زبان کے معروف شاعر اور محقق عبدالاحد آزاد (مرحوم) سے لے کر دورِ جدید کے منفرد اسلوب کے شاعر محمد یٰسین بیگ کے شعری مجموعے 'دہر آشوب' تک بیسیوں قلم کاروں کے شعری اور نثری مجموعوں پر نہایت ہی فکر انگیز دیباچے اور مقدمات رقم کئے ہیں۔ بعض تصانیف پر انہوں نے تقریظ اور آرا بھی پیش کی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان دیباچوں میں بھی وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ان کے دیباچے اور مقدمات ایک وقیع سرمایہ ہیں۔ جو تنقید وتحقیق میں ایک بیش بہا خزانہ ہے اور علمی وادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ٹینگ صاحب کے حواشی بھی غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اُن کی سرپرستی میں ریاستی کلچرل اکادمی نے شعر وادب، تاریخ، تحقیق اور آرٹ کے حوالے سے جو منازل طے کئے ہیں۔ وہ ان کی محنت، ذہانت اور خداداد صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بہت سی ایسی چیزوں کو تلاش کیا جن پر زمانے کی ناقدری کی دھول جمی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں کشمیری زبان کے نامور شاعر اور محقق عبدالاحد آزاد (مرحوم) کی کتاب کشمیری زبان اور شاعری بھی قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے اور آج بھی جبکہ کشمیری شاعری نے ایک اور بڑا پڑاؤ شروع کیا ہے، یہ تصنیف مستند تصور کی جاتی ہے لیکن آزاد کے انتقال کے وقت یہ تصنیف منتشر حالت میں تھی۔ اُن کی بے وقت موت نے انہیں اپنی

اس گراں قدر تصنیف پر نظر ثانی کرنے کا موقعہ بھی نہیں دیا تھا۔ ٹینگ صاحب نے آزاد کے اس کارنامے کو از سر نو تشکیل دیا اور اس پر جگہ جگہ حواشی سے گرہیں کھول دی ہیں اور یہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ پروفیسر القادر سروری (مرحوم) کی تصنیف کشمیر میں اردو کو بھی ریاستی کلچرل اکادمی نے ٹینگ صاحب کے بصیرت افروز مقدمہ اور حواشی کے ساتھ تین حصوں میں شائع کیا ہے۔ اس قابل قدر کتاب کی اشاعت کا پروگرام بھی سروری مرحوم کے انتقال کے بعد کئی سال تک التوا میں پڑا تھا لیکن ٹینگ صاحب کی ذاتی کوششوں سے آج ہمارے سامنے جموں و کشمیر کے شعر و ادب کی مکمل تاریخ ہے۔

ٹینگ صاحب سائنٹفک نظریہ تنقید کے حامی ہیں۔ اگر چہ وہ قدیم اور فرسودہ میزان نقد پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور نہ ان کو بروئے کار لاتے ہیں لیکن کسی ادب پارے کو جانچنے پرکھنے اور برتنے کیلئے اس عہد کا احاطہ ضرور کرتے ہیں، جس میں اس کی تخلیق ہوئی ہو انہوں نے نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقیدیں لکھی ہیں۔ ٹینگ صاحب کے ہاں آج کل کے بہت سارے نقادوں کی طرح اشعار اور اقتباسات کی بھر مار نہیں ملتی ہے لیکن وہ اپنی تنقیدوں میں کتابوں اور ادبی شخصیتوں کے نام اور ادبی تحریکوں کے متعلق واضح اشارے ضرور کرتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی تنقیدوں کو وزن دار بناتے ہیں۔ وہ ایسی نثر کو پسند کرتے ہیں جس میں نہ صرف علمیت کا مظاہرہ کیا گیا ہو بلکہ خیال ستھرا اور نکھرا ہوا ہو۔ ٹینگ صاحب کی انہی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے شمیم احمد شمیم (مرحوم) نے آج سے لگ بھگ ستائیس سال قبل اپنے مخصوص انداز میں لکھا:

> "میں پوری ذمہ داری اور دیانت داری کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ اردو زبان و بیان پر جو قدرت ٹینگ صاحب کو حاصل ہے، وہ کم از کم اس ریاست کے کسی دوسرے ادیب اور صحافی کو حاصل نہیں۔" (۱)

---

(۱) ہفتہ روزہ آئینہ، سرینگر ۷/جون ۱۹۷۵ء، ص ۸

ٹینگ صاحب کی تحریروں میں اندرونی وحدت ہے۔ قیاس آرائیوں پر عمل کرنا اُن کے مزاج میں نہیں بلکہ وہ پہلے تحقیق کرتے ہیں اور پھر بات کو وضاحت سے بیان کرنے کے قائل ہیں۔ان کا انداز تحریر منفرد ہے۔اوران کے خیالات فکر انگیز ہیں۔وہ تنقیدی میزانوں کو اپنانے کے وقت تعصب سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی فیصلہ دینے کے وقت دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اپنے انوکھے انداز میں بات کہنے کا گر رکھتے ہیں۔ زبان وبیان کے معاملے میں بھی وہ بڑے محتاط ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) لکھتے ہیں۔:

''یوسف ٹینگ اپنے سوچنے کے انداز میں اور لکھنے کے اسلوب میں ہر جگہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے اور بعض اوقات اس کو نمایاں کرنے کی طرف بھی مائل ہیں اور اس میلان کی بدولت کبھی کبھی ان کے قلم سے کچھ اچھی ترکیبیں اچھے اظہار اور لفظ ادا ہو گئے ہیں۔''

ٹینگ صاحب شاعر نہیں لیکن ان کی نثر بڑی دلکش ہوتی ہے۔تنقید کی زبان عام طور سے پیچیدہ کھردری اور سپاٹ ہوتی ہے لیکن اس طرح کا الزام ٹینگ صاحب کو نہیں دیا جاسکتا۔ان کا طرز استدلال بڑا دلنشین ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا ان کی تحریریں پڑھ کر قائل ہوتا ہے۔ ٹینگ صاحب زبان وبیان دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔وہ دورِ حاضر کے ایک اہم قلمکار ہیں۔انہوں نے تحقیق وتنقید کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیئے ہیں۔اسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

(رسا جاودانی میموریل لیٹریری سوسائٹی جموں، جموں وکشمیر اردو فورم جموں اور شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی جموں کی طرف سے منعقد کی گئی تقریب ''جشن ٹینگ'' میں ۱۲/ مارچ ۱۹۹۶ء کو شعبہ اردو جموں یونیورسٹی میں پڑھا گیا۔)

منظر اعظمی۔ چند تاثرات

ریاست جموں وکشمیر نہ صرف اپنی خوبصورتی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے بلکہ یہ ریاست ثقافت تہذیب اور کلچر کے لئے بھی صدیوں سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہاں کے صحت مند اقدار اور ادبی ورثے نے ہر وقت دنیا بھر کے عالموں، فاضلوں، دانشوروں اور فن کاروں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ ادب اور شاعری کی بات ہو تو ایسے بے شمار لوگوں کے نام ذہن میں آتے ہیں جنہوں نے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اقبالؔ، چکبست، منٹو، سرشار، چراغ حسن حسرت، قدرت اللہ شہاب، دیا شنکر نسیم، تربھون ناتھ ہجر، علامہ کیفی، آغا حشر کاشمیری، رامانند ساگر، محمد عمر نور الٰہی، رفیق خاور وغیرہ صرف چند نام ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات سے اردو شعر وادب میں رنگا رنگ پھول کھلائے لیکن ان کے علاوہ ان غیر ریاستی ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کرنا بھی ناگزیر ہے جن کا اس سرزمین سے کوئی تعلق نہیں لیکن ان کے ادبی کارناموں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان حضرات میں اثر لکھنوی، محمد دین تاثیر فوق، محی الدین قادری زور، عبدالقادر سروری، آل احمد سرور، جگن ناتھ آزاد، شکیل الرحمٰن، گیان چند جین، محمد حسن، مسعود حسین خان، عالم خوندمری، فیاض رفعت، عابد پیشاوری، کمال احمد صدیقی، مظہر امام اور زبیر رضوی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر منظر اعظمی کا نام انہی غیر ریاستی ادیبوں میں بڑے احترام کے ساتھ لیا جا سکتا ہے جو گذشتہ کئی دہائیوں سے جموں میں رہ کر اردو شعر وادب کی خدمت

کرتے رہے ہیں۔

منظر اعظمی کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) نے آج سے تقریباً بیس سال قبل ان کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا ہے:۔

''منظر اعظمی جموں کے کئی ادبی اداروں کے سرگرم رکن ہیں۔

وہ اس وقت پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو جموں یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار ہیں۔ اچھے شاعر اور اردو کے عالم ہیں۔(۱)

منظر اعظمی ایک شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی محقق بھی ہیں اور تبصرہ نگار بھی۔ وہ ادب کے ان تمام شعبوں میں طبیعت آزما چکے ہیں اور قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اگرچہ اعظمی صاحب کا اب تک کوئی بھی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے لیکن نثر میں وہ گوناگوں موضوعات پر تصانیف پیش کر چکے ہیں۔ اردو میں تمثیل نگاری، تلاش و تعبیر، اردو میں شعری زبان کی اصلاح کی کوشش وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔ اعظمی صاحب نہ صرف ادب کے جدید رجحانات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ روایتی اور کلاسیکی شعروادب سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں منظر اعظمی کی صلاحیتوں اور ان کی علمی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ڈاکٹر منظر اعظمی ایک اور ناقد ہیں ۔ اردو میں تمثیل نگاری، تلاش و تعبیر سب رس کا تنقیدی جائزہ وغیرہ ان کے متعدد تنقیدی کارنامے ہیں۔ منظر کی شگفتہ تحریروں میں ایک صاحب بصیرت ناقد کی روح مچلتی ہے ۔ وہ صاف سلجھے اور ستھرے ہوئے انداز میں اپنی بات منواتے ہیں۔(۲)

(۱) پروفیسر عبدالقادر سروری، کشمیر میں اُردو (حصہ سوئم) ص ۱۵۷

(۲) ڈاکٹر برج پریمی۔ جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما۔ ص ۹۱

منظر اعظمی نے جہاں میر، غالب، اقبال، چکبست وغیرہ جیسے اعلیٰ پایہ کے شعرا پر تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں وہاں انہوں نے مقامی شاعروں اور ادیبوں پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے منوہر لال ول، حکیم منظور، عابد مناوری، برج پریمی کے علاوہ دیگر نوآموز فنکاروں پر بھی بڑے اچھے اور فکر انگیز مقالات لکھے ہیں۔ اور ان کی ادبی حیثیت متعین کی ہے۔ جموں وکشمیر کے شعر وادب پر اعظمی صاحب کے متعدد مضامین مختلف جرائد واخبارات میں شائع ہو چکے ہیں، جو بے حد پسند کئے گئے۔ وہ وقتاً فوقتاً 'شیرازہ' ہمارا ادب، اور تعمیر سرینگر جیسے رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔ اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔

منظر اعظمی میں ایک خاص بات پائی جاتی ہے کہ وہ نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی صلاحیت اور شاعرانہ رموز نہ صرف خود اپنے آپ تک ہی محدود رکھے بلکہ وہ علم وادب کے اس چراغ سے دوسروں کو بھی روشن کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ ہماری ریاست کے نوجوان ادیبوں میں مقبول ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں اعظمی صاحب نے اپنے کئی احباب کے ساتھ بزم فروغ اردو کے نام سے جموں میں ایک ادبی انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے قیام سے جموں میں ایک نئی ادبی فضا پیدا ہوگئی۔ نوجوان تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ پختہ مشق فنکار بھی اس انجمن کی نشستوں میں باقاعدگی کے ساتھ حصہ لینے لگے۔ ۱۹۶۳ء کے بعد جموں میں اردو ادب کے فروغ میں اس انجمن کا بڑا ہاتھ رہا ہے اور بقول اعظمی صاحب کے اردو شعر وادب سے جتنے بھی نئی نسل کے ممتاز فن کار ہیں، وہ کسی نہ کسی پہلو سے اس ادارے سے منسلک رہے ہیں۔ (۱)

پروفیسر منظر اعظمی نے اگرچہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز نثر نگاری سے کیا لیکن شاعری سے بھی وہ ابتداء سے ہی شغف رکھتے تھے۔ تحقیق وتنقید کی طرف بھی انہوں نے شروع سے ہی توجہ کی چنانچہ اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور میں ان کے چند اچھے مضامین شائع ہوئے جن میں میر کی غزلوں کا فکری پہلو، اردو ڈراما نگاری اور پروفیسر مجیب، غالب کے

(۱) ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ، نومبر ۱۹۹۳ء، ص ۹

کلام میں اردو ڈرامے کا عکس، اردو غزل کی اہمیت، اردو شاعری اور انیس وغیرہ شامل ہیں
یہ مضامین اس لئے بھی پسند کئے گئے کہ ان میں ایک باصلاحیت ناقد اور محقق کی روح مچلتی
ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں پروفیسر گیان چند جین کی صحبت میں رہ کر منظر اعظمی میں فکر ونظر
کی بالیدگی پیدا ہوگئی جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"۱۹۶۷ء میں جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جو سال
ڈیڑھ سال پہلے قائم ہوا تھا، اردو لیکچرار کی حیثیت سے تقرر
ہوگیا۔ میرے ساتھ عابد پیشاوری کا بھی تقرر ہوا تھا جو کامرس
کالج میں میری جگہ ملازم ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند جین
صدر شعبۂ اردو تھے۔ ان سے مجھے کافی فائدہ ہوا خصوصاً تحقیقی
مضامین اور دوسری معلومات کے سلسلے میں۔"(۱)

منظر اعظمی کا پہلا تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ اردو میں تمثیل نگاری ۱۹۷۷ء
میں شائع ہوا۔ اس پر انہیں جموں یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ یہ اس
موضوع پر اپنی نوعیت کی اوّلین کتاب ہے۔ اس میں اعظمی صاحب نے تمثیل نگاری کے
تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اعظمی صاحب نے اردو کی پہلی تمثیل 'سب رس' کے
ماخذوں کی بازیافت میں بڑی کدوکاوش سے کام لیا ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف تمثیل
نگاری پر بحث کی گئی ہے بلکہ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، رمزیت، علامت نگاری کے ساتھ ساتھ
سب رس کے اسلوب، اس کی زبان اور اس کے تمام اہم پہلوؤں پر روشنی ڈال دی گئی ہے۔
ڈاکٹر خلیق انجم کتاب کے سرنامے میں لکھتے ہیں:

"تمثیل نگاری کے موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب
ہے۔ جسے شائع کرنے کا فخر انجمن ترقی اردو (ہند کو حاصل

(۱) ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ نومبر، ص ۹

ہے۔ڈاکٹر منظر اعظمی نے اس موضوع کے تمام اہم پہلوؤں کا
احاطہ کیا ہے...... میری نظر میں اس کتاب کی سب سے بڑی
خوبی یہ ہے کہ یہ تحقیق اور تنقید کا بہترین امتزاج ہے۔(۱)

'تلاش وتعبیر' منظر کی ایک اور کتاب ہے جو رنگا رنگ موضوعات پر دال ہے۔ یہ گیارہ سال کی مدت میں لکھے گئے ان کے اہم مضامین ہیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین ریڈیو جموں سے براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں۔ فہرست مضامین پر نظر ڈالتے ہوئے اگر چہ یہ بات شدت سے محسوس کی جاتی ہے کہ اس میں سے بعض مضامین ایسے ہیں جن پر بیسوں بار خامہ فرسائی کی گئی ہے مثلاً غالب کا تصور عشق ومحبوب، غالب کے کلام میں امید و یاس، اردو کی روایتی شاعری میں محبوب کا تصور وغیرہ۔ میرے خیال میں اعظمی صاحب کو اس بات کا خود بھی احساس ہوگا۔ لیکن ان مضامین میں بھی انفرادیت کا کوئی نہ کوئی رنگ جھلکتا ہے۔ اس کتاب میں ان مضامین کے علاوہ اور بھی کئی مضامین شامل ہیں جو موضوع کے لحاظ سے نئے ہیں۔ چند مضامین کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے جن میں اردو زبان کی گنگا جمنی روایات اور ہندو دیو مالا اور اساطیر کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔

''ہندوستان کی برگزیدہ شخصیتوں میں دو عظیم اور مقدس شخصیتیں جتنے دِلوں پر حکمران اور جتنی نظروں کی رہ نما ہیں، کم ہی ایسی ہستیاں ہوں گی ۔ ایک میں جمال کا نور روشن تر تو دوسرے میں جلال کا جلوہ عکس فگن، ایک اپنے اصولوں کا عاشق تو دوسرا خود عشق ومعرفت کے اصولوں کا خالق۔ ایک کے ہاتھ میں تیر وکمان تو دوسرا مرلی بدست۔ شری رام چندر جی اور شری کرشن جی کا نام آتا ہے۔ تو آنکھیں فرط ادب سے خود بخود جھک جاتی ہیں۔'' (اردو شاعری میں کرشن کی مرلی۔ص ۱۲۲)

(۱) پروفیسر منظر اعظمی: اُردو میں تمثیل نگاری، ص ۱۳

"سنسکرت کی قیمتی اور قدیم کتابوں کے فارسی میں منتقل ہونے سے اردو زبان کا ہندوستانی لب ولہجہ اوراس کی ہندوستانی فضا متاثر ہوئی۔ اس کے علاوہ مسلمان بادشاہوں کی مذہبی رواداری اور سیاسی بے تعصبی نے بھی آپسی تعلقات کو کافی متاثر کیا۔"

(اردو شاعری میں ہندوستانی لب ولہجہ، ص ۳۶)

"میر کی شعری عظمت کے بارے میں دورائیں نہیں۔ خود ان کے زمانے سے لے کر اب تک ان کے انداز سخن کی پیروی کی حسرت انگیز کوشش کی جاتی رہیں۔ مگر اشعار میں زخموں کی وہ کسک اور نسیم صبح کی وہ مہک پیدا نہ ہوسکی جو میر کا خاصہ ہے۔"

(میر۔ ایک عظیم ہندوستانی شاعر، ص ۲۴)

اردو میں شعری زبان کی اصلاح کی کوششیں۔ ایک جائزہ، پروفیسر منظر اعظمی کی ایک اور باوقار کوشش ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اور شعری زبان کی اصلاح کے آغاز کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں۔

منظر اعظمی کو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ وہ بڑے سلجھے ہوئے انداز میں بات کہنے کا گرر کھتے ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی ادب پر بھی اعظمی صاحب دسترس رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے مضامین میں اردو اور ہندی کے ساتھ ساتھ فارسی کے منجھے ہوئے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ ان کی زبان ثقالت سے پاک ہے۔ وہ ضرورت کے مطابق تراکیب کا استعمال کرتے ہیں اور محاورات کا بھی۔ ان کے مضامین پڑھ کر بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ بات کہنے میں کبھی تعصب سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ اپنے خیالات اور تجربات کو

بڑے موثر طریقے سے لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اعظمی صاحب جذبات کی رَو میں بہہ کر اپنے خیالات پیش کرنے کے عادی نہیں ہیں، وہ معاملے کی تہہ تک جاتے ہیں اور پھر سلجھی ہوئی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے رَوادار ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اعظمی صاحب حقیقی فنکار ہیں اور یہی کیا کم اہم ہے۔

(پروفیسر منظر اعظمی کی موجودگی میں جموں یونیورسٹی کی ایک تقریب میں پیش کیا گیا)

مشاہیر ادب کے تاثرات

● پروفیسر آل احمد سرور (اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سرینگر کشمیر)

مجھے اس بات سے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ سبھاش چندر رایہ (پریمی رومانی) نے میری نگرانی میں "جدید اُردو شاعر اور اقبال" کے موضوع پر قابل قدر اور معیاری کام کیا ہے۔ وہ ایک محنتی اور ہونہار اسکالر ہیں۔ اس تحقیقی کام کی تکمیل پر میں اُنہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

۵ر دسمبر ۱۹۸۴ء

● پروفیسر مسعود حسین خان (علی گڑھ)

پریمی رومانی کے اسلوب میں ایک خاص قسم کی شگفتگی ہے، جو اس لئے تعجب خیز ہے کہ اُردو اُن کی مادری زبان نہیں۔ اُن کا قدم خوب سے خوب تر کی جانب اُٹھ رہا ہے۔ اگر وہ اسی طرح ترقی کرتے رہے اور اپنے مخصوص میدان تنقید یعنی جدید اُردو شاعری سے باہر نہ بھٹکے تو یقیناً کچھ عرصہ کے بعد اُردو ادب میں اُن کی آواز غور سے سنی جائے گی۔

● احمد ندیم قاسمی (لاہور)

"برج پریمی ...... ایک مطالعہ" آپ کے عنایت نامے سمیت ملے۔ بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنے والد گرامی کی شخصیت اور ادبی کاوشوں کو کتابی صورت میں سمیٹ لیا۔ اب مرحوم برج پریمی صحیح معنوں میں تاریخ اُردو ادب کا ایک ناگزیر حصہ بن گئے ہیں۔

● پروفیسر گوپی چند نارنگ (نئی دہلی)

آپ کی کتاب "اقبال اور جدید اُردو شاعری" موصول ہوئی۔ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ بہت ہی مشکل موضوع ہے لیکن آپ نے اس کا حق ادا کرنے کی پوری سعی کی ہے اور آپ سے اسی کی توقع تھی۔ آپ نے اپنے والد محترم کی علمی روایت کو زندہ رکھا، جس کے لئے دِل سے دُعا نکلتی ہے۔

۲۰ رجولائی ۲۰۰۵ء

● پروفیسر عالم خوندمیری (حیدرآباد)

پریمی رومانی نئی اُردو شاعری کے مزاج سے آشنا ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ وہ عصری ادب اور نئے ادب کے فرق وامتیاز سے واقف ہیں۔

● پروفیسر قمر رئیس (نئی دہلی)

پریمی رومانی اپنے خونِ جگر سے اس چراغ کو جلائے ہوئے ہیں اور وطن سے ہجرت کے تلخ حالات میں بھی علمی وادبی کام کر رہے ہین۔

● پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں)

یہ کہنا پریمی رومانی اُردو زبان وادب سے محبت کرتے ہیں صورتِ حال کو واضح نہیں کرتا۔ صحیح صورتِ حال یہ کہنے سے واضح ہوتی ہے کہ پریمی رومانی کو اُردو زبان وادب سے عشق ہے، بے پایاں عشق۔ اور یہ بے پایاں عشق اُنہیں اپنے والد محترم آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی سے وراثت میں ملا ہے۔ جو اُردو کے ایک مسلمہ حیثیت کے نقاد، معتبر محقق اور باخبر اُستاد تھے۔ اقبال کے فکر وفن کا اثر قبول کرنے والے شعراء کے کلام کا جس طرح پریمی رومانی نے تجزیہ کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ قابل تعریف ہے۔

(تعمیر فکر۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۲۰۰۳ء)

● قمر جلال آبادی (ممبئی)

پریمی رومانی معیاری شاعری کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ پریمی رومانی رنگ ٹینگ، عالی

کدل، سری نگر کشمیر میں ایک ممتاز ادیب ڈاکٹر برج پریمی کے ہاں پیدا ہوئے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو یہ باتیں یاد نہیں رہیں گی، آپ کو یاد رہیں گے صرف ان کے پسندیدہ شعر اور ان شعروں کی وجہ سے آپ کو اُن کا نام بھی یاد رہے گا یہی ان کی مقبولیت اور کامیابی کی ضمانت ہے۔ (۱۰ر جولائی ۱۹۹۱ء)

• پروفیسر عنوان چشتی (نئی دہلی)

پریمی رومانی کو ذوق ادب ورثے میں ملا ہے۔ اُنہوں نے اس دین میں اپنے مطالعے اور مشاہدے سے بیش بہا اضافہ کیا۔ موصوف کی یوں تو کئی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں لیکن تاثرات میں پریمی رومانی ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ تاثرات میں اگرچہ تنقیدی مقالوں کے ساتھ ساتھ موصوف کے تبصرے بھی شامل ہیں مگر تبصروں میں بھی وہی تنقیدی نگاہ جلوہ فرما ہے، جو اُن کے مقالوں میں ہے۔ اس لئے اُن کے تبصرے بھی مقالوں کی طرح تنقیدی بصیرت کے حامل ہوتے ہیں۔

(۱۴ر جنوری ۱۹۹۸ء)

• پروفیسر حامدی کاشمیری (سرینگر)

پریمی رومانی اُردو شاعری خاص کر نئی اُردو شاعری کے ایک مخلص ہوش مند اور حساس طالب علم ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب میں چند نمائندہ نئے شعراء کے معروضی اور تفصیلی مطالعے کی طرف توجہ دی ہے، مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ اپنے معاصرین پر قلم اٹھاتے ہوئے ایک ناقد کے لئے جو غیر جانبدارانہ رویۂ جرأت مندی اور تاثر پذیری ناگزیر ہے۔ پریمی رومانی نے اس کا حق ادا کیا ہے۔ یہ امر بھی باعث طمانیت ہے کہ نئے شعراء پر اس نوع کا یعنی انفرادی شعراء کا مطالعہ پہلی بار اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ اہل نظر رومانی کی کاوش اور ہمت کی داد دیں گے۔

(جدید اُردو شاعری چند مطالعے۔ ڈاکٹر پریمی رومانی)

• مخمور سعیدی (نئی دہلی)

ڈاکٹر پریمی رومانی اُردو کے مشہور ناقد اور شاعر ہیں۔ وہ کشمیری ہیں اور اُردو کے ساتھ ساتھ

کشمیری زبان میں بھی لکھتے ہیں۔ پیش رفت ان کے مضامین کا مجموعہ ہے اور اقبال، ٹیگور، جوش ملیح آبادی، جگن ناتھ آزاد اور ہر چرن چاولہ کو چھوڑ کر انہوں نے زیادہ تر اُن ادیبوں اور شاعروں پر قلم اُٹھایا ہے جن کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے اور جن پر اب تک ہماری تنقید نے وہ توجہ نہیں کی، جس کی وہ مستحق ہیں۔

(ماہنامہ اُردو دُنیا، دہلی)

مظہر امام (دہلی)

ا۔ تمہاری تازہ کتاب تاثرات کل ملی، کئی مضامین پڑھ گیا۔ بڑی محنت سے لکھے ہوئے مضامین ہیں۔ بہت خوشی ہوئی کہ تم اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہے ہو اور تم نے لکھنے پڑھنے کو عبادت کا درجہ دے رکھا ہے۔

II۔ پریمی رومانی ایک نوجوان شاعر اور ناقد نہیں۔ شاعر ہونے کی وجہ سے اُنہیں شاعروں کے مطالعے میں آسانی ہوئی ہے۔ اُنہوں نے شاعروں کو ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھا ہے۔ شاعر کے نظریات اور اس کی شاعری کے خصوصی اوصاف تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے شاعروں کو ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھا ہے۔ پریمی رومانی میں جدید شاعری کے مطالعے کی ایک لگن ہے۔ ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

(اوراق۔ ڈاکٹر پریمی رومانی ۱۹۸۷ء)

پروفیسر محمود ہاشمی (لندن)

آپ کی کتاب ''تاثرات'' میں نے غور سے پڑھی۔ سب سے پہلے میں نے ''بلبل کاشمیری۔ شخص اور شاعر'' پڑھا اور آپ کی تنقیدی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ مضمون کے صفحہ نمبر ۴۵ پر دیئے ہوئے فٹ نوٹ سے آپ کی تحقیقی تگ و دو کا بھی قائل ہوا۔

اپنی کتاب میں آپ نے جہاں سیماب اکبرآبادی، حفیظ جالندھری، اثر صہبائی، قتیل شفائی، عنوان چشتی، منشی پریم چند اور کرشن چندر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ اُردو ادب پر حاوی ہیں اور اس حوالے سے آپ کی نظر بڑی دور بین ہے، وہاں آپ نے ریاست کے گنج ہائے گراں مایہ کا تعارف اور اُن کے کام کی چھان بین بھی بڑی محنت اور محبت سے کی ہے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید (حیدر آباد)

ڈاکٹر پریمی رومانی ادھر نئے لکھنے والوں میں خاصے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جدید اُردو شاعری، چند مطالعے، اوراق، ردعمل، تاثرات برج پریمی۔ ایک مطالعہ و نیز شاعری میں سنگ میل اور ان کے علاوہ کشمیری میں دو کتابیں۔ اُنہوں نے تحقیق اور تنقید دونوں سمت توجہ دی ہے اور دونوں کا حق ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر پریمی رومانی کے مطالعہ کی وسعت اور شعر و ادب کے مختلف گوشوں پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ (ماہنامہ "سب رس" حیدر آباد اگست ۲۰۰۳ء)

عرش صہبائی (جموں)

پریمی رومانی کے کلام میں جہاں زندگی کے مختلف تلخ تجربات کی چھاپ ملتی ہے وہیں پختگی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ پریمی رومانی کا کلام صحت مند رجحانات کا آئینہ دار ہے اور زندگی کے بہت قریب بھی۔ اسی لئے وہ دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ (سنگ میل از ڈاکٹر پریمی رومانی)

شیخ غلام علی بلبل کاشمیری (لندن)

میں آپ کی بے پناہ محبت کاوش اور تحقیق کی داد دیئے بنا نہیں رہ سکتا۔

ویدراہی (ممبئی)

حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ جموں میں گوشہ نشین ہو کر اتنے اعلیٰ اور معیاری ادب کی تخلیق و اشاعت میں مصروف ہیں۔ میں اس بات سے خاص طور پر متاثر ہوا ہوں کہ اپنے پسندیدہ شعراء کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ اپنی علمیت یا ادبیت کا رعب دار مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ انہیں سمجھنے سمجھانے کا ایک سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ اس طرح سے آپ ایک نیچرل عمل میں سے گزرتے ہیں اور تہہ در تہہ چھپے ہوئے معانی کی نئی نئی دُنیا اُجاگر کرتے جاتے ہیں۔ آپ کی گہری نقد و نظر اور مخلصانہ رویے کی داد دینی پڑے گی۔

• حکیم منظور (دہلی)

ڈاکٹر پریمی رومانی میرے مرحوم دوست ڈاکٹر برج پریمی کے صاحبزادے ہیں۔ اُردو زبان وادب سے اس کشمیری پنڈت گھرانے کی وابستگی مثالی ہے، لہٰذا قابلِ تعریف ہے۔ پریمی کا رجحانِ طبع اپنے والد کی طرح تنقید کی جانب مائل ہے۔ اُن کے تنقیدی مضامین کی خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔ اپنے اس تنقیدی شعور کے حوالے سے پریمی نے شعر گوئی میں اپنی راہ متعین کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ پریمی نے نہ صرف زندگی کی تلخیوں کو بھوگا ہے بلکہ اُن کو اپنی راہ کی روشنی بھی بنایا ہے۔ اس لئے اُن کی شاعری میں یاس پر آس کا غلبہ ہے۔ جو ایک مثبت رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔

۲۲ر اپریل ۲۰۰۱ء

• پروفیسر منظر اعظمی (جموں)

پریمی رومانی جموں وکشمیر کے ایک باصلاحیت ادیب ہیں۔ وہ ایک بڑے ادیب باپ کے بیٹے ہیں۔ ادب سے شغف انہیں ورثے میں ملا ہے .... وہ بڑے مرنجان مرنج، غیر متعصب اور غیر جانبدار اہلِ قلم ہیں۔ اس خصوصیت نے انہیں مختلف مکتبہ فکر کے شاعروں اور ادیبوں کے کمالِ فن کو پرکھنے اور اُن کا مقام ومرتبہ متعین کرنے میں مدد دی۔

• زبیر رضوی (نئی دہلی)

پریمی رومانی کے تنقیدی رویے اور احتساب کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ نئی تنقید جسے سلیم احمد، شمس الرحمٰن فاروقی، باقر مہدی، وارث علوی اور وحید اختر نے فروغ دیا، اس کے گرویدہ نظر آتے ہیں .... اُن میں پرکھنے اور پھر اپنی پرکھ کی روشنی میں فیصلہ دینے کی ہمت پیدا ہو چکی ہے اور یہ بھی کم اہم نہیں۔

(۴ر اگست ۱۹۸۰ء)

• پدم شری موتی لال ساقی (جموں)

نئی نسل کے لکھنے والوں میں پریمی رومانی کا نام توجہ کا تقاضا کرتا ہے۔ پریمی نے اپنا ادبی سفر ایک شاعر کے طور پر شروع کیا مگر وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ آپ کی ادبی سرگرمیوں کا دائرہ کار کشادہ

 ۱۵۱۰